جلد ۹۰ | ستمبر ۱۹۷۸ء | عدد ۱

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن

کے اجزاء

****

تفسیر پارۂ اوّل	۶/۵۰ روپے
تفسیر سورہ الفاتحہ والبقرہ	۹/- "
تفسیر سورہ التوبہ	۶/۵۰ "
تفسیر سورہ الفرقان	۳/- "
تفسیر سورہ لقمان	۲/- "
تفسیر سورہ یٰسٓ	۲/۲۵ "
تفسیر سورہ الفتح	۲/۲۵ "
تفسیر سورہ الحجرات	۲/۵۰ "
تفسیر سورہ الرحمٰن	۲/۲۵ "

اِدارہ ترجمان القرآن، اِچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۰ | ستمبر ۱۹۷۸ء مطابق شوال ۱۳۹۸ھ | عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۱۰۱۷

زر سالانہ بیس روپے۔ فی پرچہ ۲/- روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

روزوں کا مہینہ —— ماہِ صیام —— جب آتا ہے تو جہاں کہیں وبا دبایا اسلام بھی موجود ہوتا ہے، اس کی خوشبو فضا میں پھیل جاتی ہے۔ مسلمانوں کے جس گھر یا جس بستی یا جس ملک پر اس ماہِ مبارک کا پرتو پڑتا ہے، اس کا نقشہ عام حالات سے بدل جاتا ہے۔ تارکِ نماز لوگ کپڑے پاک کر کے صفِ نماز میں آکھڑے ہوتے ہیں، احکامِ دین کی پابندی سے آزاد رہنے والے مرد و زن روزہ دار ہو جاتے ہیں، گھروں اور مسجدوں میں قرآن پڑھا جانے لگتا ہے، کچھ لوگ اسی مہینے میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، بصورتِ دیگر عام صدقات دینے کے لیے ہاتھ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ سحری اور تراویح اور افطار کے سلسلے بالکل نئی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بعض غلط مشاغل یا آمدنیوں یا جرائم کے پروگراموں کو اس مہینے میں معطل کر دیتے ہیں۔

یہ وہ ظاہری علامات ہیں جو اس حدیثِ رسولؐ کی تصدیق کرتے ہیں کہ شیاطین ماہِ رمضان میں پابجولاں کر دیے جاتے ہیں۔

قرآن و سنت کے سرمایۂ علم و حکمت سے یہ حقیقت اخذ ہوتی ہے کہ ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ایک شیطان اس پر مامور ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے اس کی ملکوتی قوتوں کو بے اثر بنائے اور سفلی رجحانات کو ابھار کر عصیان و طغیان کی راہ پر اسے گامزن کر دے۔ اب اگر کوئی صاحبِ ایمان فرد ماہ صیام کا حق ادا کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، اپنی جسمانی ضرورتوں اور خواہشات کو احکامِ الٰہی کے تابع کر دیتا ہے، قرآن پڑھتا ہے اور سنتا ہے، نماز باجماعت خصوصاً تراویح

کے مجمعے میں شریک ہوتا ہے، سحر و افطار کے وقت مسنون کلماتِ ذکر و دعا ادا کرتا ہے، کچھ خیرات کرتا ہے، بعض لوگوں کا روزہ افطار کراتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا شیطان تو زنجیروں میں جکڑا گیا اور بالکل بے بس ہو کے رہ گیا۔ اس طرح گویا ہزارہا مسلمانوں کے ساتھ لگے ہوئے شیاطین کے سب کے کام کے راستے بند ہو گئے اور وہ مقید ہو کے رہ گئے۔

یہ حدیث جب کبھی بیان ہوتی ہے تو کچھ حضرات یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر شیاطین قید ہو جاتے ہیں تو پھر برائی دنیا میں کیوں باقی رہتی ہے۔ اس کے جواب میں چند نکات قابلِ غور ہیں۔

۱۔ اہلِ کفر و شرک اور ایسے جرائم کار جن کی فطرتِ سلیم تباہ ہو چکی ہو، ایسے ظالم اور مستبد اور متکبر لوگ جنہوں نے اپنے جوہرِ انسانیت کو غارت کر دیا ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اسیریٔ شیاطین والی حدیث کا اطلاق اُن پر، اُن کی بستیوں اور اُن کے ممالک پر کیا جائے۔ مثلاً پہلا ماہِ صیام جب روزے فرض کیے گئے تھے، عین اسی مہینے کے وسط میں میدانِ بدر میں وہ پہلا معرکہ حق و باطل گرم ہوا جس کا ایک فریق مسلمان تھے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کمان میں جانیں لڑا رہے تھے، اور دوسرا فریق قریشِ مکہ اور اُن کے حلیف تھے جو پیغمبرِ خدا اور مسلم جماعت کو مٹا دینے کے ارادے سے اُٹھے تھے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ مدینے کے مسلمانوں پر کام کرنے والے شیاطین تو مقید تھے، لیکن اشرارِ مکہ کے شیاطین کو قید میں ڈالنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہے۔

۲۔ شیاطین کا کام ایسا ہے کہ جیسے چھوت لگا دینا۔ وہ جب ظلم و شر اور عصیان و طغیان کے جراثیم انسانی قلب میں اُتار دیتے ہیں تو اگر ایمان و ضمیر میں قوتِ مدافعت ہو تو وہ کچھ روک تھام کرتا ہے۔ مگر شیاطین بھی ملیریا کے مچھر کی طرح بار بار اور روز روز جراثیم کی نئی کھیپ اندر داخل کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی قلب و ضمیر میں مرض جڑ پکڑ لے۔ اب اگر شیاطین قید میں بھی ہوں تو ان کا کام جاری رہتا ہے۔ اُن کے بوئے ہوئے بیج اگر کسی مٹی میں جگہ پا چکے ہوں تو روئیدگی کا سارا عمل خود بخود ہوتا رہے گا۔ اس دور میں "آٹومیٹک کنٹرول" کی اصطلاح عام ہے۔ شیاطین بھی اپنے زیرِاثر انسانوں میں عادت کے قانون کے ذریعے ایک طرح کا آٹومیٹک کنٹرول پیدا کر دیتے ہیں۔

شیاطین اپنے معمول انسانوں کے قلب و ضمیر میں شیطنت کا ایک اڈا یا عصیان و طغیان کا ایک دفتر قائم کر لیتے ہیں۔

۴۔ قرآن میں شیاطینِ جن کے ساتھ ساتھ شیاطینِ انس کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ دراصل انسانوں میں شیطنت کے کام کو پھیلانے کے لیے شیاطینِ انس ہی کی ضرورت ہوتی ہے ــــ شیاطینِ جن تو ایک یا چند افراد پر خفیہ طریقوں سے کام کرتے ہیں۔ شیاطینِ انس رو در رو آکر، اسٹیجوں پر تقاریر کرتے ہیں، اخبارات میں اداریے اور نوٹ شائع کرتے ہیں اور ادب میں شعر و افسانہ کو فنی جمال کے ساتھ سامنے لاتے ہیں۔ وہ استدلال کرتے ہیں، بڑے لوگوں کے حوالے دیتے ہیں، سلوگن ایجاد کرتے ہیں، اصطلاحیں وضع کرتے ہیں، جذباتی آثار چڑھاؤ کا مظاہرہ کرتے ہیں ــــ ہوٹلوں میں آپ کو چائے پلاتے ہیں۔ سینماؤں اور نائٹ کلبوں یا کبھی کبھار مسجدوں، اسکولوں اور لائبریریوں میں آپ کے پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ ان شیاطینِ انس کا کوئی توڑ نہیں۔ عالمی ادارات میں، سرمایہ اور پروپیگنڈے کو کنٹرول کرنے والی تنظیموں میں، فوجوں اور عدالتوں اور پولیس میں، نہ جانے کتنی تعداد کہاں کہاں گھسی ہوتی ہے۔ پھر کوئی صدر ہوگا، کوئی سیکرٹری، کوئی وزیر، کوئی ڈاکٹر، کوئی محقق، کوئی کمانڈر، کوئی ناولسٹ، کوئی مصورہ، کوئی رقاص، کوئی فلم اسٹار ــــ غرض ان کے ہزار روپ ہیں۔

شیاطینِ جن کا مقابلہ آسان اور شیاطینِ انس کا مقابلہ بے حد مشکل ہے۔ مثل ہے کہ آدمی کا شیطان آدمی۔ یعنی جس طرح آدمی کو سنوارنے کے لیے خود اسی کی جنس سے انبیاء اٹھائے گئے، اسی طرح اسے بگاڑنے کا بھی وسیع اور موثر کام آدمی ہی کر سکتا ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی بیرونی قوت کسی ملک پر اپنا پنجہ گاڑنے کے لیے منصوبہ بنائے، اور پھر اس منصوبے کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے ہدف بننے والے ملک کے اندر ہی سے وہ کچھ ایسے ایجنٹ فراہم کرے جو فلسفہ و فکر کے دائرے میں، ادب و شعر کے دائرے میں، صحافت اور پروپیگنڈے کے دائرے میں اور ٹریڈ یونینز اور لیبر کے دائرے میں، اساتذہ اور طلبہ کے دائرے میں، سیاسی پارٹیوں اور مذہبی گروہوں کے دائرے میں، بیرونی قوت کی دی ہوئی گائیڈ لائن کے مطابق کام کرتے رہیں۔ ابلیسی نظام بھی اسی نہج پر کام کرتا ہے، افراد کی انفرادی زندگیوں میں خلل اندازی کے علاوہ

شیاطین تاک کر ذہین لوگوں اور اہم شخصیتوں اور با اثر اکابر اور نوجوان ایجی ٹیٹرز پہ اپنا جادو چلاتی ہیں یا شیطنت کے جراثیم ان کے اندر اتارتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خود شیاطین کے کان کترنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ اب شیاطینِ جن کا کام ختم ہوگیا۔ انہوں نے شیاطینِ انس تیار کرکے میدان میں اتار دیے۔ اب خود انہیں تو صرف جائزہ لیتے رہنا ہے اور رپورٹیں اور اعداد و شمار مرتب کرنے کا اہتمام رکھنا ہے۔

اس بار ماہِ صیام آیا تو معاشرے کا رنگ ذرا سا بدلا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں شیطانوں کو زیادہ بھاری زنجیریں پہنائی گئی ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا رمضان ہے جس میں کم سے کم لاہور کی حد تک (جہاں تک میرا مشاہدہ محدود ہے) بالعموم ایسا نہیں ہے کہ لوگ چلتے پھرتے سگریٹ پی رہے ہوں، یا پانی کی دکانوں پر کوکا کولا اور سیون اَپ سے شاد کام ہونے والوں کی قطاریں لگی ہوں یا چھوٹے بڑے ہوٹلوں، تنوری طعام خانوں اور اشیائے خوردنی و نوشیدنی بیچنے والے "فٹ پاتھیوں" نے چادریں تان رکھی ہوں اور ایسے مریضانِ عشق ہر جگہ ہجوم کیے ہوئے ہوں جو زبانِ حال سے ایک بہت پرانی مشہور گھٹیا سی غزل کا یہ مصرعہ الاپ رہے ہوں کہ "میں مریضِ عشق ہوں، میری دوا پردے میں ہو"۔ اب کے وہ پردے والے مریضانِ عشق بھی غائب ہیں، اور بنا بریں پردے بھی غائب! طعام اور شربت وغیرہ کی دکانیں کہیں تین چار بجے شام کو کھلتی ہیں۔ دوپہر یا قبل دوپہر کو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی نے پانی کی دکان سے فانٹا یا آرسی کی بوتل مانگی اور دکاندار نے انکار کر دیا۔

یہ تبدیلی اس حد تک صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ مسجدوں میں خطبوں اور کتابی اور اخباری تحریروں کے ذریعے تو پہلے ہی احترامِ رمضان کی تلقین کی جاتی رہی ہے، اور بہت سے لوگ اسی تلقین کی وجہ سے رضاکارانہ طور پر احتیاط کرتے ہیں۔ مگر جب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ابتدائے رمضان کے وقت احترامِ رمضان کی اپیل کی ہے اور اس کے لیے حکومت اور اس کے کارندے نیک نیتی اور مستعدی سے حرکت میں آگئے ہیں تو پھر کیسے رمضان کے ساتھ وہ مذاق روا رکھا جا سکتا ہے جو

ہمارے ہاں کے بڑے اور چھوٹے دُنیا پرستوں اور شکم پرستوں نے روا رکھا ہے۔

دوسرا اچھا شگون یہ ہے کہ متذکرہ صورتِ حالات گواہی دیتی ہے کہ پاکستانی قوم جیسے بھی برے احوال سے دوچار چلی آ رہی ہے، اگر اس کی اصلاح صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کی جائے تو اسے ہر قسم کی پستیوں سے نکالا جا سکتا ہے۔

ہم اسی تصور کے تحت کام کر رہے ہیں کہ ایک طرف دعوت و تلقین اور تربیت و تزکیہ کا کام ہونا چاہیے، دوسری طرف حکومت کو اجتماعی پہلو سے جو حصہ کسی امر کے نفاذ یا انسداد کے لیے ادا کرنا لازم آتا ہے وہ اسے کرنا چاہیے، اور پھر یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ قوم خیر و فلاح کی طرف ہی لپکے گی۔

احترامِ رمضان کا یہ تصور بڑا کمتر درجے اور منفی نوعیت کا ہے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔

اصل احترامِ رمضان یہ ہے کہ رمضان آئے تو آدمی عبادت و طاعت کے لیے کمر کس لے۔

احترامِ رمضان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ روزے رکھے جائیں، تراویح ادا کی جائے، قرآن کو پڑھا، سنا اور سمجھا جائے اور اس کو سرمایۂ عمل بنایا جائے۔

احترامِ رمضان یہ ہے کہ جھوٹ بولنے اور جھوٹے فلسفوں اور جھوٹے تصورات پر عمل کرنا ترک کیا جائے، غیبت، چغلی، بدزبانی اور بہتان بازی سے اجتناب کیا جائے۔

اور احترامِ رمضان ہی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ اشیائے خورد و نوش اور دیگر ضروریات کا نہ تو ذخیرہ کیا جائے، نہ انہیں زائد منافع کے لیے فروخت سے روکا جائے، نہ ناپ تول میں فرق کیا جائے اور نہ گراں فروشی کی راہ اختیار کی جائے۔ اس ایک مہینے میں خدا اور رسولؐ کی محبت اتنی تو کارفرما ہونی چاہیے کہ بڑے بیوپاری اور چھوٹے کاروباری بہت ہی کم منافع پر اکتفا کریں، یا بعض صورتوں میں کوئی چیز بغیر منافع کے فروخت کریں، اور زیادہ بلند مقام یہ ہے کہ نقصان اٹھا کر بھی خدا کے بندوں کو سہولت دی جائے۔ یقیناً اس ایثار کے بدلے میں اللہ تعالیٰ بقیہ گیارہ مہینوں میں ایثار کرنے والوں کو خاص برکات سے نواز سکتا ہے۔

ہمارے یہاں پہلے ایک روشن مثال ایسی قائم ہو چکی ہے کہ اُسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ آج بھی ایسا ممکن ہے۔ جہادِ ستمبر ۱۹۶۵ء کے دنوں میں اشیاء کی رسد میں مشکلات غیر معمولی تھیں، مگر لاہور کی حد تک تو میں گواہی دیتا ہوں کہ یہاں ضروریات کے نرخوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اگر ستمبر ۱۹۶۵ء میں ایسا ہو سکتا تھا تو اب اگست ۱۹۷۸ء میں وہی کچھ کیوں نہیں ہو سکتا۔

میں تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ سوچتا ہوں کہ شہروں کے ہر محلے اور باہر کے ہر گاؤں میں ایسے لوگ ہونے چاہییں تھے جو افطار یا غذا کے مختلف سامان خرید کر باری باری روزہ داروں کو مختلف دنوں میں مفت فراہم کرتے۔ مثلاً کوئی صاحب اپنے گھر کے آس پاس کے دس، بیس یا سو پچاس گھروں میں کسی دن مفت گوشت تقسیم کرا دیتے، کسی دن کوئی صاحب پاؤ پاؤ بھر انگور یا کھجور کے دو چار درجن پیکٹ بانٹ دیتے۔ ایک ایک حلقے میں اگر ایسے دس دس اہلِ خیر آگے آ جاتے تو معاشرے کی فضا بے حد متاثر ہوتی۔ شاید دکانداروں کو بھی گراں فروشی پر شرم آنے لگتی۔ مختلف زمروں کی طرف سے ایسا سلسلۂ خیر جاری ہو سکتا تھا۔

ان ساری چیزوں کے بعد احترامِ رمضان کی وہ شکل بھی سامنے آتی ہے کہ اگر کوئی شخص بیماری یا مسافرت یا کسی اور وجہ سے روزہ نہ رکھ سکا ہو تو کم سے کم اُس کی روزہ خوری کا حال دوسروں پر کھلنا نہیں چاہیے کہ یہ روزہ خوری کی تبلیغ کی ایک صورت ہے۔ ایک کو دیکھ کر دوسرا جرأت حاصل کرتا ہے۔

بہت اچھا ہوا کہ اس مرتبہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے خود ہی افتتاحِ رمضان کی تقریب میں یہ ضرورت ظاہر کر دی کہ یومِ پاکستان یا یومِ استقلال ۲۷ رمضان المبارک کو منایا جانا چاہیے۔

فی الحقیقت دورِ نبوت کے ساتھ رمضان کے سلسلے میں پاکستان کو ایک مبارک نسبت حاصل ہے۔

وہاں مدینہ کی اسلامی ریاست کا ظہورِ عام غزوۂ بدر سے ہوا۔ اور غزوۂ بدر اس پہلے ماہِ صیام کے وسط میں واقع ہوا جس میں روزے فرض کیے گئے تھے۔ پھر یہی رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ بھی ہے۔ پاکستان کی تشکیل کا اسی مہینے میں واقع ہونا اپنے اندر ایک بشارت رکھتا ہے۔

یہ تو ہماری بدقسمتی تھی کہ انگریزی دور کے مسلط کردہ عیسوی کیلنڈر نے ہمارے ہجری کیلنڈر کو دبائے رکھا۔ اب اگر پاکستان میں ہجری کیلنڈر کو اہمیت دی جائے اور "ایام اللہ" پر ہماری نظریں مرتکز ہوں تو ہمارے بہترین جذبات کی آبیاری ہو سکتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اسی سال یوم استقلال ۲۷ رمضان المبارک کو منانے کا اعلان ہو جاتا اور اس کی تعمیل ہو جاتی۔

اب یہ سعادت آگے کے لیے ملتوی ہو گئی ہے۔

باتیں رمضان المبارک کی چھڑ گئیں، حالانکہ جب یہ اوراق قارئین تک پہنچیں گے تو یا تو وہ عید منا رہے ہوں گے، یا اس کے لیے تیاریاں کر رہے ہوں گے۔

ہماری عید کا مرکزی جوہر نماز عید اور صدقہ فطر اور تکبیرات ہیں۔ یہ ہماری مخصوص اسلامی تہذیب ہے کہ ہم یوم مسرت بھی مناتے ہیں تو خدا فراموشی کی کیفیت نہیں ہوتی۔ ہم ایک لمبے دورِ عبادت کی آزمائش و تربیت کے دور سے کامیابی کے ساتھ گذرنے پر خدا کے شکر کے طور پر عید الفطر مناتے ہیں۔ ہر چند کہ اچھے کپڑے پہننے اور اچھے کھانے کھانے اور عزیزوں دوستوں سے میل ملاقات اور بچوں کی تفریح اور جائز قسم کے کھیل تماشوں کی گنجائش دی گئی ہے۔ مگر عید الفطر کو کسی ایسے طریق سے نہیں منانا چاہیے کہ روزے رکھ کر اور تراویح پڑھ کر اور قرآن مجید کی تلاوت کر کے اور صدقہ و خیرات کر کے جو کردار پیدا کیا گیا ہو، اُسے طوفانِ مسرت میں ڈبو دیا جائے، اور پھر سارا سال اس طرح گذرے کہ نہ خدا کا خوف، نہ رسولؐ کی محبت اور نہ آخرت کے حساب کتاب کا تصور۔ بس جہازِ عمرِ رواں پر سوار نجانے کدھر سے کدھر جا رہے ہیں۔

عید اس طرح منانی چاہیے کہ ماہِ صیام کی برکات ہمارے ساتھ رہیں اور سارا سال ہمارے لیے زادِ راہ بنی رہیں۔

(باقی اشارات بر صفحہ ۴۶)

تعزیراتِ اسلام

جناب مولانا قاضی بشیر احمد صاحب - باغ - آزاد کشمیر

(۱۰)

تشریح :-

عصمت دم کا اعتبار فعلِ قتل کے وقت ہوگا۔

۱۔ قتل کے موجبِ قصاص ہونے کے لیے امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک مقتول کا صرف فعلِ قتل کے وقت اور صاحبین رح کے نزدیک فعلِ قتل اور موتِ مقتول دونوں اوقات میں، معصوم الدم ہونا ضروری ہے۔

تمثیل :- ایک شخص نے دوسرے کو تیر مارا مگر تیر لگنے سے قبل وہ مرتد ہوگیا۔ پھر اس کو تیر لگا اور وہ مرگیا تو امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک تیر مارنے والے پر دیت عاید ہوگی جو مرتد کے ورثا کو دیجائیگی اور اگر یہ قتلِ خطا ہو تو دیت اس کی عاقلہ پر ادا کرنا لازم ہوگی اور اگر عمداً ہو تو قاتل کے مال سے واجب الادا ہوگی اور صاحبین رح کے نزدیک قاتل پر کوئی چیز عائد نہ ہوگی۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ مقتول کی موت پر کہا جائے گا کہ قاتل کا فعل، فعلِ قتل تھا اور مذکورہ صورت میں قاتل سے سوائے تیر پھینکنے کے اور کوئی فعل صادر نہیں ہوا۔ اور مقتول کی موت پر معلوم ہوا کہ قاتل سے صادر ہونے والا فعل، فعلِ قتل تھا اور بوقت صدورِ فعل یعنی تیر پھینکنے کے وقت، مقتول معصوم الدم تھا، لہٰذا قاتل پر قصاص نافذ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مقتول کے مرتد ہونے کی وجہ سے اس کی عصمت میں

شبہ پڑ گیا، اس لیے قصاص ساقط ہو گا اور دیت عاید ہو گی۔

صاحبین فرماتے ہیں کہ فعلِ قتل کا تعلق، قاتل اور مقتول دونوں سے ہے جس کا اثر مقتول کی موت پر ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا عصمت کا اعتبار بھی دونوں وقتوں میں کیا جائے گا[۱]

لیکن تیر پھینکنے کے وقت مقتول حربی یا مرتد تھا اور تیر لگنے سے قبل وہ مسلمان ہو گیا۔ پھر اس کو تیر لگا اور وہ مر گیا تو صاحبین فرماتے ہیں کہ قاتل پر کوئی چیز عائد نہ ہو گی۔ جس سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کا موقف قوی ہے کیونکہ اس صورت میں صاحبین نے بھی تیر پھینکنے کے وقت کا اعتبار کر کے قاتل پر کوئی چیز عائد نہیں کی، اگر وہ موت کے وقت کا اعتبار کرتے تو قاتل پر قصاص لازم آنا چاہیے تھا۔

علاوہ ازیں صاحبین کا امام صاحب کے ساتھ ان مسائل میں بھی اتفاق ہے کہ:۔

ایک شخص نے شکار کو تیر مارا مگر تیر پھینک کر شکاری مرتد ہو گیا پھر شکار کو تیر لگا تو یہ شکار کھایا جائے گا۔ (اگرچہ احتیاطاً نہ کھانا بہتر ہے)۔ اور ایک آدمی تیر پھینکنے کے وقت مجوسی تھا اور تیر مار کر وہ مسلمان ہو گیا پھر شکار کو تیر لگا تو یہ شکار نہ کھایا جائے گا[۲] تو اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کا موقف زیادہ صحیح ہے۔

نتیجہ ۲ (ب) اگر کوئی شخص دوسرے مسلمان کو صرف زخمی کر دے اور مجروح زخمی ہونے کے بعد مرتد ہو جائے۔ پھر وہ زخم کے سرایت کر جانے کی وجہ سے مر جائے تو اس صورت میں اس کا خون رائیگاں جائے گا[۳] اس صورت میں مقتول، زخم کے سرایت کر جانے کی وجہ سے فوت ہوا ہے اور بوقت سرایت وہ مرتد ہو چکا تھا۔

نتیجہ ۳:۔

مقتول قاتل کا جزء نہ ہو۔

(۱) مقتول اگر قاتل کا نسلی طور پر جزء ہو تو قصاص ساقط ہو گا۔ لہٰذا باپ یا دادا اگر بیٹے یا پوتے یا اس کے نیچے کے آدمی کو قتل کر دے۔ یا ماں یا دادی یا نانی اپنے بیٹے یا نواسے

---

[۱] البدائع ص ۲۵۳ جلد ۷ [۲] ایضاً

[۳] البدائع ص ۲۵۳ جلد ۷۔

کو قتل کر دے تو قصاص ساقط ہوگا۔[1]

یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ کا ہے اور امام شافعیؒ بھی اس کی تائید فرماتے ہیں۔ مندرجہ ذیل دلائل اس مسلک کی بنیاد ہیں:۔

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "لَا يُقْتَلُ وَالِدٌ بِوَلَدِهٖ" یعنی والد کو اپنے بیٹے کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی حدیث کے مطابق فیصلہ بھی کیا ہے جس سے کسی ایک صحابی نے بھی اختلاف نہیں کیا جو اجماع کی دلیل ہے۔[2]

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی اسی مضمون کی حدیث مروی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ "لَا يُقَادُ الْوَالِدُ بِوَلَدِهٖ"[3] یعنی بیٹے کے بدلے میں والد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ"[4] یعنی تو اور تیرا مال، تیرے باپ کے لیے ہے۔ اس حدیث میں بیٹے کے مال اور اس کی ذات کو باپ کی ملکیت قرار دیا ہے، اور جس طرح غلام کے بدلے آقا کو قصاص کی سزا نہیں دی جاتی۔ یہاں اگرچہ بیٹا باپ کا حقیقتہً مال نہیں ہے تاہم شبہ کو پیدا کرنے کی ایک معقول دلیل ہے اور شبہ سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔[5]

۴۔ ایک اور حدیث میں آپ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهٖ وَاِنَّ وَلَدَهٗ مِنْ كَسْبِهٖ۔ ایک اور دوسری حدیث میں آتا ہے۔ اِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ فَكُلُوْا مِنْ كَسْبِ اَوْلَادِكُمْ۔[6]

مذکورہ احادیث میں اولاد اور اولاد کی کمائی کو باپ کا مال قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا قصاص کو ساقط کرنے کے لیے اسی قدر شبہ کافی ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اگر (والدین) تیرے پاس (ہوں) اُن میں سے ایک

---

[1] احکام القرآن للجصاص۔ ص ۱۴۴، ۱۴۵ جلد ۱

[2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً

یا دونوں کے دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں سو ان کو کبھی (ہاں سے) ہوں بھی مت کہنا اور نہ اُن کو جھڑکنا اور ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور اُن کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا اور (ان کے لیے حق تعالیٰ سے) یوں دُعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحمت فرمائیے جیسا کہ انہوں نے مجھ کو بچپن (کی عمر) میں (رحمت سے) پالا۔"

(بنی اسرائیل - آیت: ۲۴ - از بیان القرآن)

اس آیت میں اولاد کے لیے والدین کی اطاعت کو ہر حالت میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا والدین کو قصاص میں قتل کرنا اس کے خلاف لازم آئے گا۔ اس لیے قصاص ساقط ہوگا۔ چنانچہ حنظلہ بن ابی عامر نے جب اپنے مشرک باپ کو قتل کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو منع کر دیا حالانکہ وہ مشرک ہونے کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ بھی کرتا تھا اور قریش کے ساتھ مل کر غزوۂ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے آیا تھا۔ اگر باپ کو قتل کرنا کسی حالت میں جائز ہوتا تو اس حالت میں باپ کو ضرور قتل کیا جاتا۔ مگر جب کہ اس حالت میں بھی باپ کو قتل کرنے کی اجازت آپ نے نہیں دی تو معلوم ہوا کہ باپ کو بیٹا کسی بھی حالت میں قتل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بیٹے کے بدلے باپ سے قصاص ساقط ہوگا۔ چنانچہ اسی احترام کی وجہ سے باپ کو بیٹے کے قرض کی وجہ سے قید نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ بیٹے پر تہمت زنا لگائے تو اس پر حدِ قذف جاری نہ ہوگی۔ اگر وہ بیٹے کا ہاتھ وغیرہ کاٹ دے تو باپ کے اسی عضو کو قصاص میں نہ کاٹا جائے گا۔[۱]

تشریح ۲ (ب)

حدیث " لَا يُقَادُ الْوَالِدُ بِوَلَدِهٖ " میں لفظ والد اور ولد عام ہے۔ لہٰذا والد کا لفظ باپ، دادا، پردادا وغیرہ اُوپر کے تمام افراد کو اور " ولد " کا لفظ بیٹا اور اس کے نیچے یعنی پوتا وغیرہ سب کو شامل ہے۔[۲]

---

[۱] احکام القرآن ص ۱۴۵ جلد ۱

[۲] البدائع ص ۲۳۵ جلد ۷

ج - شق ۱ میں باپ وغیرہ مذکورہ افراد کو قصاص میں قتل کرنے پر وراثت بیٹے یا پوتے وغیرہ کو پہنچتی ہو تو اس صورت میں بھی قصاص ساقط ہوگا[۱]

تمثیل:- ماں یا باپ میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا اور ان کا ایک بیٹا ہے جس کو قصاص کا حق حاصل ہے مگر والدین کے احترام کی وجہ سے قصاص ساقط ہوگا[۲]

تشریح ۹:-

قصاص لینے کے لیے محل قصاص کا وجود ضروری ہے۔

اگر مجرم فوت ہو جائے یا جرم ارتداد میں قتل ہو جائے یا کسی دوسرے قصاص میں قتل ہو جائے یا بغیر حق کے ہی قتل ہو جائے تو اس طرح کی جملہ صورتوں میں قصاص کا حصول ناممکن ہے لہٰذا قصاص ساقط ہوگا[۳]

پھر اس طرح کے سقوطِ قصاص کے بعد آیا دیت اس کے ترکہ سے ادا کی جائے گی یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک دیت واجب نہ ہوگی۔ امام شافعی رح کا بھی ایک قول ایسا ہی ہے۔ البتہ اُن کے دوسرے قول کے مطابق دیت واجب ہوگی[۴] ان دونوں حضرات کے درمیان اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ سزا صرف قصاص متعین ہے یا قصاص اور دیت دونوں میں سے کوئی ایک؟ پہلا موقف امام ابوحنیفہؒ کا ہے اور دوسرا امام شافعی رح کا۔ اس کی تفصیل تشریح ۱۲ میں آئے گی۔

تشریح ۱۰ (الف)

قصاص معاف کرنے کے احکام۔

۱- قصاص ولی جائز کے معاف کرنے سے ساقط ہوگا[۵]

۲- ولی اگر بالکل معاف نہ کرے بلکہ مال لے کر قصاص ترک کرے تو بھی قصاص ساقط ہوگا اور مال

---

[۱] البدائع ص ۲۳۵ جلد ۷ ہدایہ ص ۵۶۳ جلد ۴

[۲] ہدایہ حاشیہ ۹

[۳] البدائع ص ۲۴۶ جلد ۷ [۴] ایضاً [۵] ایضاً

واجب الادا ہوگا۔[1]

۳۔ قصاص معاف کرنے کی صورت میں حاکم مجاز اگر کسی مجرم کے بارے میں یہ باور کرے کہ اس کی رہائی عام مسلمانوں کے حق میں اُس کو سزا دیے بغیر بہتر نہ ہوگی تو مستغیث مقدمہ کی حد تک قصاص ساقط ہوگا البتہ قاضی اس کے مخصوص حالات کے پیش نظر تعزیری سزا دینے کا مجاز ہوگا۔ یہ سزا سخت سے سخت بھی ہوسکتی ہے اور نرم سے نرم بھی۔

تشریح نمبر ۱ (ب):۔

قصاص کی سزا سے شریعت کا مقصد صرف مستغیث کی داد رسی ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ عام مسلمانوں کے خون کی حفاظت بھی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا" سے واضح ہے اس لیے عدالت مجاز عام مسلمانوں کے خون کی حفاظت کے لیے تعزیری سزا دینے کی مجاز ہوگی۔

تشریح نمبر ۱ (ج):۔

قصاص معاف کرنے کی شرائط:۔

قصاص معاف کرنے کے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:۔

اگر اُن میں سے کوئی ایک بھی فوت ہو جائے تو قصاص معاف نہ ہوگا۔

۱۔ معاف کرنے والا صاحبِ حق ہو۔

۲۔ معاف کرنے والا عاقل ہو۔

۳۔ معاف کرنے والا بالغ ہو۔[2]

تشریح نمبر ۱ (د):۔

مجروح کے معاف کرنے کا حکم

اگر معاف کرنے والا خود مجروح (زخمی) ہو تو مندرجہ ذیل تفصیل کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

۱۔ معاف کرنے کے بعد اگر مجروح تندرست ہوگیا ہو تو اُس کا معاف کرنا صحیح ہوگا۔

---

[1] البدائع ص ۲۴۶ جلد ۷ [2] ایضاً

۲۔ اگر معاف کرنے کے بعد زخم کے سرایت کر جانے کی وجہ سے مجروح فوت ہو جائے اور یہ قتل عمداً ہو تو دیکھا جائے گا کہ :-

ا۔ اگر مجروح نے یہ کہا ہو کہ میں نے قتل یا زخم اور زخم سے پیدا ہونے والے اثر کو معاف کر دیا ہے تو یہ قتل معاف ہوگا۔[1]

ب ۔ اگر اس نے صرف اتنا کہا ہو کہ میں نے زخم کو معاف کیا ہے تو اس صورت میں قصاص میں شبہ پیدا ہو گیا ۔جس سے قصاص تو ساقط ہوگا ۔ البتہ دیت قاتل کے مال سے ادا کی جائے گی ۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے اور صاحبین کے نزدیک قاتل پر کوئی چیز لازم نہ آئے گی۔[2]

۳ ۔ معاف کرنے کے بعد اگر مجروح زخم کے سرایت کر جانے کی وجہ سے فوت ہو جائے اور یہ قتل خطأً ہو تو دیکھا جائے گا کہ :-

ا ۔ اس صورت میں مرنے سے قبل اس نے یہ کہا ہو کہ میں نے قتل یا زخم اور اس سے پیدا ہونے والے اثر کو معاف کر دیا ہے تو یہ معاف کرنا صحیح ہوگا اور قاتل پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی ۔ یہ صورت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مجروح صاحب فراش نہ رہا بلکہ چلتا پھرتا رہا ہو اور اسی حالت میں اس نے معاف کیا ہو۔[3]

ب ۔ اگر مجروح چلنے پھرنے سے معذور تھا اور صاحب فراش ہی رہا ہو اور اسی حالت میں اس نے مذکورہ الفاظ کہہ کر قاتل کو معاف کیا ہو تو اس معافی سے قصاص تو ساقط ہو جائے گا البتہ دیت کے حق میں مکمل معافی نہ ہوگی ، بلکہ تیسرے حصہ کی حد تک ہوگی ۔ اور دیت کے دو حصے قاتل کی عاقلہ سے وصول کیے جائیں گے۔[4]

تیسرے حصے کی حد تک معافی اس لیے ہوگی کہ یہ مرض الموت میں مریض کا تبرع ہے جو ایک ثلث کی حد تک نافذ العمل ہوگا۔[5]

---

[1] البدائع ص ۲۴۹ جلد ۷ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] ایضاً [5] ایضاً

تشریح نمبر (۸)۔

ولی مقتول کے معاف کرنے کا حکم۔

۱۔ (ا) مقتول کی موت کے بعد اگر کوئی ولیٔ مقتول صرف ایک فرد ہو تو اُس کے معاف کرنے سے قصاص معاف ہو جائے گا۔ اور قاتل پر کوئی چیز عائد نہ ہوگی [۱]

(ب) اگر مقتول کی ولایت میں ایک سے زائد افراد ہوں اور ان میں سے اگر کوئی ایک بھی قصاص معاف کر دے تو قصاص ساقط ہو گا۔ البتہ سوائے معاف کرنے والے کے باقیوں کو ان کے حصے کی حد تک دیت دی جائے گی [۲]

تشریح نمبر (۹)

قصاص چونکہ قابل تجزی چیز نہیں ہے کہ معاف کرنے والے کی حد تک چھوڑ کر باقیوں کے لیے قصاص کی سزا نافذ کی جائے۔ اس لیے ایک کے معاف کرنے سے کلیتہً قصاص ساقط ہو گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود، اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے منقول ہے کہ انہوں نے بعض اولیاءِ مقتول کے معاف کرنے کی وجہ سے قصاص کلیتہً ساقط کر دیا تھا اور جنہوں نے معاف نہیں کیا تھا۔ ان کو اُن کے حصہ کی دیت دی گئی تھی۔ اور ان حضرات نے یہ کام حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی موجودگی میں کیا تھا اور کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ لہٰذا یہ ایک اجماعی حکم کی حیثیت رکھتا ہے [۳]

نیز زید بن وہب سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک آدمی لایا گیا جس نے کہ دوسرے کو قتل کر دیا تھا اور مقتول کے ورثا آپ کے پاس قصاص کا مطالبہ کرنے کے لیے حاضر ہوئے اتنے میں مقتول کی بیوی نے کہا کہ "میں قصاص معاف کرتی ہوں"۔ یہ عورت قاتل کی بہن تھی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "اللہ اکبر" کا جملہ کہتے ہوئے فرمایا کہ اس عورت نے (قانونِ قصاص کے تحت ہونے والے) ایک مقتول کو آزاد کر دیا ہے"۔

---

[۱] البدائع ص ۲۴۹ جلد ۷

[۲] البدائع ص ۲۴۷ ج ۷، و عالمگیری باب الصلح والعفو

[۳] البدائع ص ۲۴۷ جلد ۷

ایک اور واقعہ میں بھی ایک مرد کے قتل کا مقدمہ آپ کے پاس دائرہ کیا گیا اور مقتول کی اولاد آپ کے پاس حاضر ہوئی۔ لیکن بعد میں بعض نے قصاص معاف کر دیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ معاف کرنے والوں نے قصاص میں قتل ہونے کو روک دیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا یہ (یعنی ابن مسعودؓ) ایسی تھیلی ہے جو علم سے بھرپور ہے[۱]

۲۔ مقتول کی موت سے قبل ولی کا معاف کرنا۔

ا۔ زخمی ہونے کے بعد ابھی وہ فوت نہیں ہوا تھا کہ ولی نے قصاص معاف کر دیا تو اس صورت میں قصاص معاف ہوگا اور قاتل پر کوئی چیز عائد نہ ہوگی۔

تشریح نمبر (د)

اس صورت میں مرنے سے قبل ولی کا معاف کرنا بظاہر صحیح نہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ قصاص کا حق مرنے کے بعد ولی کو ملتا ہے۔ مگر چونکہ سببِ موت موجود ہے جس کو قتل کے قائم مقام کر کے اس پر قتل کا حکم لگا دیا گیا ہے جیسا کہ فقہاء نے نوم (نیند) کو حدث کا قائم مقام کر کے اس پر حدث یعنی بے وضو ہونے کا حکم لگایا ہے۔

۳۔ لفظ معافی کے بجائے لفظ صلح کا استعمال۔

اگر مجروح نے لفظ معافی کے بجائے لفظ صلح استعمال کیا ہو تو دیکھا جائے گا کہ:۔

ا۔ اگر مجروح یہ کہنے کے بعد تندرست ہو گیا ہو تو صلح صحیح ہوگی خواہ قطع یا جراحت عمداً ہو یا خطاءً۔

ب۔ اگر زخم کے سرایت کرنے کی وجہ سے وہ فوت ہو گیا ہو تو پھر اگر اس نے یوں کہا ہو کہ "میں نے قتل یا زخم اور اس سے پیدا ہونے والے اثر پر صلح کی ہے تو یہ صلح صحیح ہوگی۔ اگر اس نے قتل یا زخم کے اثر کا ذکر نہ کیا ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ صلح صحیح نہ ہوگی اور عمد کی صورت میں قاتل کے مال سے پوری دیت وصول کی جائے گی اور خطاء کی صورت میں مالِ صلح واپس کیا

[۱] المغنی لابن قدامہ ص ۳۸۹ جلد ۹

جائے گا اور پوری دیت قاتل کی عاقلہ پر واجب الادا ہوگی[1]

۴۔ ایک قاتل کو معاف کرنے سے اس کے شریک سے قصاص ساقط نہ ہوگا۔

تشریح ۱۱ (ا)؛۔

اگر ایک سے زائد افراد نے مل کر قتل کیا ہو اور ولی مقتول اگر ان میں سے کسی ایک کو معاف کر دے تو اس سے دیگر شرکاء سے قصاص ساقط نہ ہوگا[2]۔

تشریح ۱۱ (ب)؛۔

قصاص معاف کرنے کا قرآن میں حکم۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے؛۔

"پھر جس کو معاف کیا جائے اپنے بھائی کی طرف سے کچھ بھی، تو تابعداری کرنی ہے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہیے اس کو خوبی کے ساتھ۔"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قاتل کو اس کے فریق مقدمہ کی طرف سے کسی حد تک معافی ہو جائے (یعنی پوری معافی نہ ہو) تو قاتل سے قصاص تو ساقط ہو جائے گا، البتہ خون بہا کی رقم مقررہ مقتول کے ولی کو قاتل ادا کرے گا۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے۔

"ہم نے نفس کے بدلے نفس کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ مگر جو کوئی معاف کر دے تو معاف کرنے والے کے لیے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔" (المائدہ: ۴۵)

اس آیت سے مکمل معاف کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

تشریح ۱۱ (ج)

معاف کرنے کے بعد مجرم کو قتل کرنا موجب قصاص ہوگا۔

۱۔ اگر ولی مقتول ایک شخص ہو اور وہ قصاص معاف کرنے کے بعد پھر قاتل کو قتل کر دے

---

[1] البدائع ص ۲۴۹ جلد ۷

[2] البدائع ص ۲۴۷ جلد ۷

تو اُس سے قصاص لیا جائے گا۔[۱]

۲۔ اگر وارث مثلاً دو آدمی تھے جن میں سے ایک نے قاتل کو معاف کر دیا لیکن دوسرے نے اُس کو قتل کر دیا تو ایسی صورت میں دیکھا جائے گا کہ اس نے اگر باوجود یہ جاننے کے کہ اب قاتل کو قتل کرنا حرام ہے، قتل کیا ہو تو اُس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ البتہ اس کو قاتل کے مال سے نصف دیت ملے گی اور اگر اس کو حرام ہونے کا علم نہ تھا تو اس صورت میں اُس کے مال سے اس پر دیت واجب ہوگی خواہ اس کو عفو کا علم ہو یا نہ ہو۔[۲]

(باقی)

---

[۱] البدائع جلد ۷ ص ۲۴۷

[۲] عالمگیری۔ کتاب الجنایات، باب الصلح والعفو۔

رَبُّ العالمین

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

زمین و آسمان کے مالک کا دسترخوانِ ربوبیت اپنی پوری وسعت، فراخی، تنوع، ہمہ گیری اور ہمہ پہلو خصوصیاتِ رزق رسانی کے ساتھ کائنات گیر سطح پر ہر طرف اور ہر کہیں ہر جگہ بچھا ہوا ہے، جس سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنی ضرورت اور حیثیت کے مطابق مستفید ہو رہا ہے۔ ہر لمحہ اور ہر لحظہ اُس کی ربوبیت کی نئی شان ہے اور ہر شان حیرت انگیز قدرت و ہمہ گیری کے ساتھ ساری مخلوقات کو رزق پہنچا رہی ہے۔

احادیث کی رُو سے اللہ تعالیٰ کے ننانوے صفاتی اسماء مبارک ہیں۔ جن میں سے ہر نام مالک کی کسی صفت کا مظہر ہے اور اس کی صفات لامحدود ہیں۔ اس کے مطیع فرمان بندہ کے لیے اُس کی ہر صفت پیاری اور دلنواز ہے۔ جس صفت پر بھی غور و فکر کیا جائے چشمِ تصور کے سامنے حیرت انگیز وسعتوں کا ایک وسیع منظر پھیل جاتا ہے اور انسان حیران و ششدر ہو کر رہ جاتا ہے، اس طرح وہ پوری بیچارگی اور بے بسی سے اپنی مجبوری اعترافِ زبان سے بس اعترافِ حقیقت ہی کر سکتا ہے۔ بیانِ حقیقت اس کے بس سے باہر ہے۔ وہ جوں جوں ان صفات پر غور کرتا ہے اس کا سرِ عجزِ بندگی سے اور جھکتا چلا جاتا ہے۔ اس کی پیشانی اظہارِ بندگی کی سجدہ ریزی کے لیے بے تاب ہو جاتی ہے اور وہ اپنے مالک کے احسانات کے بوجھ سے دبا ہوا زبان سے الحمد للہ والشکر للہ کی تکرار کیے بغیر اور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی ہستی تو ان نعمتوں سے پورا پورا استفادہ کرنے اور ان کا کما حقہ لفظی شکر بجا لانے تک سے عاجز ہے۔ مالک کی ہمہ گیر اور ہمہ نوع

وسیع نعمت رسانی کے مقابلے میں بندے کی محدودیت اور بے چارگی شکرِ خداوندی کا حق ادا کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔

اِن صفاتِ خداوندی میں ربوبیت کی صفت ایک ایسی صفت ہے جس نے ساری کائنات کی ہر مخلوق کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اس کی کارپردازی پر غور کریں تو اس ارشاد کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ موت اور رزق ہر ذی رُوح کا تعاقب کرتے ہیں اور اگر اس تک پہنچنے کے سارے راستے بھی مسدُود ہو جائیں تو ایک ذی رُوح کے پاس جس راستے سے اُس کی موت آسکتی ہے اُسی راستے سے اُسے رزق پہنچتا، اس کی ضروریات کا کفیل ہوتا اور اُس کی زندگی کا سبب بنتا رہتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری کلام میں اپنے بندوں سے اپنا سب سے پہلا تعارف جس صفت کے ذریعے کرایا ہے وہ یہی صفت ربوبیت ہے۔ سورہ فاتحہ کا پہلا ہی جملہ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ "ساری تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو پوری کائنات کا پالنے والا ہے"۔ گویا اللہ تعالیٰ پہلے مرحلے پر ہی اپنے بندوں سے اپنے جس نام کا سب سے پہلے تعارف کرانا حکمت وضرورت کے عین مطابق سمجھتا ہے وہ اس کا محبوب صفاتی نام "رب" ہے اور اس کی صفتِ ربوبیت ہے۔ اپنی مخلوق سے اس صفت کا تعارف بلاشرط وتخصیص کرایا گیا ہے۔ اس میں ایمان وانکار کی بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ یہ مالک کی وہ صفت ہے جو خالق کی حیثیت سے خود بخود اُس کی مخلوق ...... کے ساتھ لازم وملزوم ہے اور خالق کے ذمے جس طرح مخلوق کا حقِ پرورش تسلیم کیا گیا ہے اس میں مخلوق کی اس حیثیت کے سوا کہ وہ مخلوق ہے اور کوئی دوسری شرط نہیں لگائی گئی۔

رب کا لفظ جس مادہ سے بنا ہے اس کے معنی ہیں پالنا پوسنا، پرورش کرنا، درست حالت میں رکھنا، عام خطرات اور نقصانات سے بچاتے ہوئے اور ارتقاء ونشوونما کے سارے اسباب فراہم کرتے ہوئے نقطۂ کمال تک پہنچا دینا۔ اسی طرح یہ لفظ مالک، آقا، مربّی، پرورش کرنے والا، پروردگار، پالنہار، خبرگیری اور نگہبانی کرنے والا، فرمانروا، حاکم، مدبّر اور منتظم کے معنوں میں آتا ہے اور ان سب کا جامع ہے۔ ظاہر ہے کہ مالک اور آقا ہی اپنے غلاموں کی ضروریات کا کفیل اور

ذمہ دار ہوتا ہے۔ پروردگار اور خبر گیری کرنے والے کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ پرورش اور خبر گیری کرے۔ فرمانروا اور حاکم کا حقِ فرمانروائی اور حقِ حکومت بھی پرورش اور خبر گیری سے ہی متعین و مستحکم ہوتا ہے اور تدبیر و انتظام میں یہ بات بدرجہ اتم داخل ہے کہ جس کا رخانہ ہست و بُود کا نظم و تدبر پیشِ نظر ہے اس کارخانے کی تمام مشینوں، تمام پُرزوں اور اس کی دیگر تمام ضروریات کا اہتمام و انصرام بھی کیا جائے۔ اس لیے فی الاصل رزق رسانی، پرورش اور نگرانی و خبر گیری کی خصوصیات رب العالمین کی جملہ صفات میں اوّلین اہمیت رکھتی ہیں۔

اِسی لیے اُس نے اپنے کلام پاک میں اپنی اس صفت کا بار بار ذکر کیا ہے اور بندوں کو جس امر کی طرف سب سے زیادہ متوجہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ بندے اپنے پالنے والے کی بندگی بجالائیں۔ قرآن نے بندوں کو مالک کی آقائیت، ربوبیت، الوہیت، مسجودیت اور وحدانیت کی طرف متوجہ کیا ہے اور انھیں اس کے اعتراف کی دعوت بھی دی ہے لیکن یہ بات کہیں بھی نہیں کہی گئی کہ تمھیں اپنا رزق حاصل کرنے کے لیے اللہ کی ان صفات کا اقرار کرنا چاہیے۔ اور پھر یہ کہ رزق حاصل کرنے کے لیے یہ اور یہ تدابیر اختیار کرنی چاہییں اور یوں اس کے لیے اِس اِس طرح تگ و دو کرنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالق پرورشِ مخلوقات کو اپنے ذمے کا کام قرار دیتا ہے۔ اور بندگی اطاعت، عبادت اور فرماں برداری کو مخلوق کے ذمے کا کام قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے ذمے کا کام ہر لمحہ، ہر لحظہ، ہر گھڑی، ہر ساعت اور ہر حالت، ہر صورت، ہر جگہ، ہر کہیں، اور ہر کسی کے ساتھ سرانجام دے رہا ہے اور وہ خالق کے حقوق کی ادائیگی کا کام اپنی مخلوق سے سرانجام دیے جانے کی توقع رکھتا اور تکرار کے ساتھ اس کا حکم دیتا ہے۔ مخلوقات میں بھی ہر کہیں یہی نظر آتا ہے کہ اُن کا وسیع ترین دائرہ ہمہ تن بندگی اور عبادت و اطاعت میں ہی مصروف ہے، کہیں بھی انکار و انحراف یا بغاوت نہیں ہے۔ آقا نے جس شے کے لیے جو قانونِ طبعی مقرر کر دیا ہے وہ اس کی اطاعت میں شب و روز مصروف و سرگرداں ہے۔ کوئی اس سے لحظہ بھر کے لیے بھی انحراف کی جرأت نہیں کرتا۔ عالمِ طبیعات کا تمام تر حلقہ اسی امر کی گواہی دیتا ہے۔

سورج بہت ہی قوی ہیکل مخلوق ہوتے ہوئے ایک طویل گردش کا سفر طے کر کے ایک عاجز اور مطیعِ فرمان بندے کی طرح وقت مقرر پر مشرق سے سر نکالتا ہے اور دُنیا والوں کے بارے میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے میں شب و روز مصروف ہے۔ سورج اپنی ڈیوٹی میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی نہیں

کرتا۔ چاند اپنے مدار کے گرد حکم کا بندہ بنا ہوا سرگرداں رہتا ہے۔ تارے اُس کے حکم سے اپنے اپنے حدود میں گردش کرتے اور ٹمٹماتے ہیں۔ سمندر، دریا اور ندی نالے اس کے حکم کے بندے ہیں۔ وہ اس کی بتائی سمت اور اسی کے مقرر کردہ راستوں پہ پوری شانِ بندگی سے رواں دواں رہتے ہیں۔ اور ساری کائنات کی ساری مخلوق اس بندگی کی یک طرفہ شاہراہ پر چلی جارہی ہے۔ بندگی کی اس ایک ہی سمت اور ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں کروڑوں اور اربوں چیزوں کے سفر میں کہیں کوئی باہمی ٹکراؤ نہیں ہے۔ کوئی تصادم نہیں ہے، کوئی فساد نہیں ہے۔ پوری کائنات پوری ہم آہنگی سے بندگی کے وسیع و عریض راستے پر گامزن ہے۔ قوانین طبیعیات کی یہ شاہراہ بندگی ایسی ہے کہ اس شاہراہ پر کوئی تصادم نہیں ہے۔ لیکن اس سارے ہجوم مخلوقات میں صرف ایک انسان ہے جسے نہایت ہی محدود سے دائرے میں اُس کی مرضی اور ارادے کی تھوڑی سی آزادی دے دی گئی ہے۔ یہ تھوڑی سی آزادی کا دائرہ ہی اس کا دائرہ مسئولیت ہے۔ اس کی زندگی میں اس کے اعضاء وجوارح اس کے امروز و فردا، اس کے آس پاس کے ذرائع و وسائل اور سروسامانِ زیست سب اسی طبعی بندگی کی جبلی زنجیر میں بندھے ہوتے ہیں۔ لیکن انسان کو اپنے ارادے اور مرضی کی تھوڑی سی آزادی کا احساس میسر ہے اور اسی دائرہ آزادی میں جس عظیم فساد و تباہی کا سلسلہ اُس نے دُنیا میں اپنی آمد کے بعد سے شروع کر رکھا ہے اس کی مثال کائنات کی کسی دوسری مخلوق کے دائرے میں موجود نہیں ہے۔ بے شعوری، بے علمی، اور بے خبری کی آزادی سخت خطرناک چیز ہے۔ اِسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے اپنی ربوبیت کا ایک دوسرا مظہر سلسلۂ نبوت کی صورت میں ظاہر فرمایا ہے۔

رزق رسانی اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کا وہ پہلو ہے جو وسیع ترین، کامل ترین اور جامع ترین ہے۔ اُس کی وسعت، اس کی باریکیاں اور نزاکتیں خود مالک ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اس کتاب ہدایت میں ہر دور کے انبیاء کی معرفت بار بار انسان کے سامنے یہ بات ضرور آتی رہی ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوقات کا رب ہے اور رازق خود اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور اس معاملے میں اصولی تقسیم کی تمام تر حکمت اسی کے بالاتر علم میں ہے۔

وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (البقرہ - ۲۱۲) — اللہ کو اختیار ہے جسے چاہے بے حساب رزق دے۔

ملک، حکومت اور عزت و دولت، بھلائی اور بلندی کے بارے میں اپنے کلی اختیارات کا اظہار کرتے ہوئے اور رات کو دن میں پرونے، دن کو رات میں داخل کرنے، جاندار کو بے جان میں سے نکالنے اور بے جان کو جاندار میں سے خارج کرنے کے حیرت انگیز عمل کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے پھر اس بات کو دوہرایا ہے کہ:- وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران - ۲۷) وہ جسے چاہتا ہے اپنا رزق بے حساب دیتا ہے۔

چونکہ وہ سب کا خالق ہے، اس لیے وہ سب کا رازق بھی ہے اور جس طرح اس نے خلق میں کسی ملک و ملت کا امتیاز نہیں رکھا ہے اسی طرح رزق رسانی میں بھی اُس نے کسی ملک و ملت کا امتیاز نہیں کیا ہے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد یہ دُعا کی:-

"اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔"

تو اس کے جواب میں رب العالمین نے اپنی ہمہ گیر رزاقی کے پیش نظر حضرت ابراہیمؑ کے تصور میں فوراً اصلاح کر دی اور فرمایا کہ:-

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (سورۃ البقرۃ - ۱۲۶)

ترجمہ "جو نہ مانے گا دُنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان رزق تو میں اسے بھی دوں گا البتہ آخر کار اُسے عذاب جہنم میں جانا ہوگا جو بدترین ٹھکانہ ہے"

اپنی سرکشیوں کے نتیجے میں یہود پر وبال پڑا تو وہ خدا کو بھی جلی کٹی سنانے لگے کہ ہمارے لیے تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ یہودیوں کی ان جلی کٹی باتوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ:-

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ (المائدہ ۶۴)

ترجمہ:- "اللہ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے"۔

کفارِ قریش کے مذاق اُڑانے کے جواب میں بھی یہی فرمایا گیا ہے:-

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (الانعام-۱۴)

ترجمہ "کہو اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا سرپرست بنالو، اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے، جو روزی دیتا ہے اور روزی لیتا نہیں ہے"۔

پھر مشرکینِ مکہ کو ہدایت دیتے ہوئے جو اپنی لڑکیوں کو رزق کے ڈر سے قتل کر دیتے، یا انہیں زندہ دفن کر دیتے تھے، فرمایا :-

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ

(الانعام - ۱۵۱)

"اپنی اولاد کو تنگی کے ڈر سے قتل نہ کرو کیونکہ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔"

گویا رزق کا کلی اور مکمل ذمہ صرف اللہ رب العالمین کا ہے اور اس سلسلے میں جو لوگ اس کام کو اپنا ذاتی ذمہ سمجھ کر منصوبہ بندیاں کرتے اور افراد اور قوموں کو مبتلائے مصیبت کرتے ہیں وہ اپنی جہالت کے سوا اور کسی چیز کا ثبوت فراہم نہیں کرتے۔ رزق رسانی کا انتظام خدا کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے اور یہ وہ خدا ہے جس نے زمین بنائی اور اس پر انسان کو لا کر بسایا ہے جس طرح وہ پہلے آنے والی انسانی مخلوق کو رزق دے رہا ہے اسی طرح وہ بعد میں آنے والی مخلوق کو بھی رزق دے گا۔ جس نسبت سے آبادی بڑھتی چلی جاتی ہے اسی نسبت سے اس زمین کا مالک معاشی ذرائع و وسائل بھی بڑھاتا چلا جاتا ہے اور اگر اس دنیا میں وارد ہونے والا انسان کھانے کے لیے ایک منہ لے کر آتا ہے تو کام کرنے والے دو ہاتھ بھی وہ اپنے ہمراہ لاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اسی صفتِ رزاقی نے حضرت زکریاؑ کو بے تاب کر دیا تھا جب انہوں نے حضرت مریمؑ کے حجرے میں موسم بے موسم اور وقت بے وقت رنگ برنگ کے پھل پھول اور سر و سامانِ زندگی دیکھے۔ انہوں نے پوچھا کہ مریمؑ اتنا کچھ یہ سامان تمہارے پاس اس گوشہ نشینی میں کہاں سے آتا ہے؟ مریم نے نہایت معصومیت سے جواب دیا تھا۔

هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران - ۳۷)

ترجمہ: "یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے، بے حساب دیتا ہے۔"

رب العالمین، پرورش کرنے والا اور رزق دینے والا ہونا اتنی بڑی متفق علیہ حقیقت ہے کہ اس سے کبھی کفار کو بھی انکار نہیں ہوا۔ چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے کہتا ہے کہ ذرا ان منکرینِ دین سے یہ تو پوچھو کہ ان کو زمین و آسمان سے رزق کون دیتا ہے اور کون تدبیرِ عالَم

کرتا ہے؟

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (یونس - ۳۱)

ترجمہ:- ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں۔ کون بے جان سے جاندار کو اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے۔ کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کو کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ تو کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں ہو؟

پھر رب العالمین منکرینِ حق سے، جو رزق کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہتے ہیں۔ جو زیادہ رزق ملنے پر غرور و تکبر سے اکڑ بازی اور شیخی کرتے ہیں اور رزق کم ہونے پر سخت مضطرب اور بدحال ہو جاتے ہیں، ان سے کہتا ہے:-

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (ھود - ۶)

ترجمہ:- زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ صاف دفتر میں درج ہے۔

اندازہ کیجیے کہ ہر جاندار کا رزق جو مختلف انواع کا ہے، ہر جاندار کا ٹھکانہ کہ وہ کہاں کس کس حال میں رہتا ہے اور مر کر کہاں سونپا جاتا ہے، ہر چیز اُس مالک کے ریکارڈ کی کتاب میں واضح طور پر درج ہے۔ اس لیے کہ وہ رب العالمین ہے۔ جب وہ رزق دیتا ہے تو اُسے رزق لینے والے کے کوائف سے آگاہی اور اُس کے طرزِ عمل سے واقفیت بھی ضروری ہے اور اسے رزق رسانی میں وہ کسی کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کی مشیت اس کا اندازہ خود لگاتی ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (الرعد ۲۶)

ترجمہ:- اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے کم رزق دیتا ہے۔

راہ حق کے شہداء کے بارے میں فرمایا گیا کہ:۔

إِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ لَيُدْخِلَنَّهُم مُّدْخَلًا يَرْضَوْنَهُ وَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (سورۃ الحج ۵۹)

ترجمہ:۔ اور اللہ ہی بہترین رازق ہے وہ اُن کو ایسی جگہ داخل کرے گا جس سے وہ خوش ہو جائیں گے، بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔

طلاق کے معاملے میں باہمی زیادتی سے منع کیا گیا اور مرد کے ذمے عدت کے دوران کا پورا خرچ لگایا گیا۔ ساتھ ہی مرد کو دل کی تنگی سے بھی منع کیا گیا کہ وہ یہ نہ کہے کہ وہ اپنے پاس سے دے کر کچھ احسان کرتا ہے۔ بلکہ درحقیقت اللہ ہی ہے جو اُسے بھی رزق دیتا ہے۔

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق - ۳)

ترجمہ:۔ اور اللہ اُس کو ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اُس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ رب العالمین اپنے بندوں کو رزق دینے میں ایسا ہی فراخدلانہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو ایسے راستوں سے رزق دیتا ہے جدھر سے رزق ملنے کا انہیں گمان بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بندوں کو اپنی رزق رسانی کے حیرت انگیز ذرائع اور طریقوں سے حیران کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی ربوبیت کی وسعتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ بے حد و حساب بھلائیاں اور خوبیاں اس کی ذات سے ہر چہار طرف پھیل رہی ہیں۔ وہ ایسی بلند و برتر ہستی ہے کہ کہیں اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی۔ اور وہ ایسی فیاض اور فراخ دست ہستی ہے کہ کہیں اُس کی سخاوت اور فراخی تمام نہیں ہوتی۔ اُس کی ہر خوبی مستقل ہے اور اُسے زوال نہیں ہے۔ باری تعالیٰ اپنی تمام بر تر خوبیوں اور بھلائیوں کے ساتھ اپنی مخلوق کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اور اُس کی ساری مخلوق اس کی فیاضی، رزق رسانی اور خزائن کی فراوانی سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ پھر اُس کی بے لاگ فیاضی کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ وہ مومن و کافر، تابع و نافرمان سب پر مساوی و محیط ہے۔ کسی کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اس کی فیض رسانی کو اپنے لیے ہی مخصوص و محدود کر لے یا اپنے کسی مخالف گروہ کو اس سے محروم کر دے۔ وہ نیک و بد ہر فریق کو دُنیا کی زندگی میں اپنی عمومی صفتِ ربوبیّت

کی بنا پر سامانِ زیست دیے چلا جا رہا ہے۔ یہ اُس پروردگار کا خاص عطیہ ہے اور اس کی عطا کو روکنے کی کسی میں ہمت جرات نہیں ہے۔

حضرت ابراہیمؑ سے جب ان کی قوم نے جھگڑا کیا تو انہوں نے قوم سے پوچھا کہ جن بُتوں کو وہ پُوجا کرتے ہیں کیا وہ انہیں کوئی نفع یا نقصان بھی پہنچاتے ہیں اور جب انہوں نے نفی میں جواب دیا تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ میں تو ان سب مُبتوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔ میں تو صرف اس پروردگار رب العالمین کو مانتا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا ہے، جو میری رہنمائی کرتا ہے، مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے رب العالمین کو تسلیم کرنے کا جو سبب بیان کیا ہے وہ اُس کی ربوبیت ہے۔

یہ اُس کی ربوبیت کا ہی مظہر ہے کہ وہ پیدا کرتا ہے۔ لیکن پیدا کر کے کسی کو دُنیا میں یوں ہی چھوڑ نہیں دیتا بلکہ قدم قدم پر اس کی مدد، رہنمائی اور خبر گیری کرتا ہے۔ اس کی پرورش، نگہداشت اور حاجت روائی کرتا ہے۔ انسان کی دُنیا میں آمد سے پہلے ہی وہ اس کی ماں کے سینے میں دُودھ پیدا کر کے اس کا راشن جاری کر دیتا ہے۔ اس وقت چونکہ اس کے منہ میں دانت نہیں ہوتے اور اسے ہلکی زود ہضم اور پتلی غذا (LIQUID DIET) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے لیے دُودھ کا راشن مقرر کیا جاتا ہے۔ اس وقت اگر اُسے دُودھ پینا نہ آئے تو گوشت کے اس بے خبر لوتھڑے کو دُنیا کی کوئی طاقت بھی پینا نہیں سکھا سکتی۔ لیکن رب العالمین اپنے بندے کو ماں کے پیٹ سے ہی جبلتہً دُودھ پینے کی ترکیب بتا کر اور اس کی تربیت دے کر بھیجتا ہے تاکہ وہ جاتے ہی سب سے پہلے اپنی روزی کی خوراک حاصل کر سکے۔ پھر یہ تربیت و رہنمائی اُسے زندگی کے ہر ہر مرحلے پر حاصل ہوتی رہتی ہے اور کوئی ان دیکھی قوت پوری عمر اور عمر کی پوری مدت کی آخری گھڑی تک برابر اُس کی مدد، حفاظت، خبر گیری، حاجت روائی اور تربیت کا فریضہ سر انجام دیتی رہتی ہے۔ زندگی کے جس جس مرحلے پر جس جس نوعیت کے سروسامان کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے، نشوونما اور بقاء و ارتقاء کے مقاصد پورے کرنے کے لیے وہ اسے ہر ہر قدم پر فراہم کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ سروسامان زمین سے آسمان تک ہر کہیں پھیلا ہوا ہے۔ پھر اس سروسامان سے استفادہ کرنے اور کام لینے کی قوتوں اور صلاحیتوں کی اسے جس درجہ ضرورت اور حاجت ہوتی ہے وہ سب

اُسے عطا کر دی جاتی ہیں۔

زندگی کے جس شعبے سے اُسے واسطہ پڑتا ہے اور اُسے وہاں جس جس نوعیت کی رہنمائی درکار ہوتی ہے، وہ اُسے پوری طرح فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے وجود کو محفوظ اور کارآمد رکھنے کے لیے جن اسباب و سروسامان کی اس کے وجود کے اندر اور باہر حاجت ہوتی ہے وہ سب اسباب اور سروسامان اُسے فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حفاظت وارتقاء کے یہ سروسامان نہ ہوتے تو انسان معمولی سے حادثے کا شکار ہو کر ہی ختم ہو جاتا۔ خالق و پروردگار کی یہ ہمہ پہلو اور ہمہ گیر ربوبیت ہے جو ہر آن اور ہر پہلو سے اس کی دستگیری کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس ذات کے علاوہ کسی کو اپنا حاجت روا اور دستگیر سمجھنے سے زیادہ بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے۔ حقیقت عظمیٰ تو یہی ہے کہ اسی رب العالمین کا دامن تھاما جائے اور اسی کے آگے سر عبودیت جھکایا جائے، اس لیے کہ تنہا وہی اس بات کا حقدار ہے کہ اس کے سامنے سجدہ ریزی کی جائے اور اُس کی اس عظیم و وسیع و ہمہ گیر ربوبیت کا شکر ادا کیا جائے۔

اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

أَمَّن يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَن يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ءَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ؟ (سورۃ النمل - ۶۴)

ترجمہ:- اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتداء کرتا اور اس کا پھر اعادہ کرتا ہے اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ان کاموں میں حصہ دار ہے؟

یہ چیلنج اس لیے ہے کہ حقیقتاً" اس چیلنج کا کوئی جواب نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ نہ خلق پیدا کرنا کوئی سیدھا سادا کام ہے اور نہ خلق کی رکھوالی، پرورش اور اس کی ہر لحظہ بدلنے والی ضروریات کی کفالت کسی کے بس کی بات ہے۔ اس زمین پر لاکھوں ہی قسم کے حیوانات ہیں جن میں سے ہر نوع کے کروڑوں اور اربوں بلکہ کھربوں افراد موجود ہیں۔ اور ہر لمحہ نئے سے نئے وجود میں آرہے ہیں۔ کچھ مر رہے ہیں کچھ پیدا ہو رہے ہیں جو ہیں وہ مختلف مراحل میں ہیں اور زندگی کے ہر مرحلے میں ان کی ضروریات و حاجات مختلف ہیں۔ ان کی صرف غذائی ضروریات کا ہی اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے تو انسان دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ان سب کی

غذائی ضروریات کا سامان ان کی قریب ترین دسترس میں رکھ دیا گیا ہے اور وہ بے پناہ مقدار میں موجود ہے جس کے نتیجے میں وہ خود بخود خوراک پاتے ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی خوراک سے محروم نہیں رہتا۔ اس فراہمیٔ غذا میں اتنی بے شمار قوتیں زمین سے آسمان تک کام کرتی ہیں کہ انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ اگر سورج کی گرمی، ہوا کی روانی، پانی کی سیرابی اور زمین کے مختلف مادے ٹھیک ٹھیک تناسب سے باہم مل کر غذا کا سامان مسلسل اور پیہم نہ کرتے رہیں تو اُن کو غذا کا ایک ذرہ بھی مہیا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ربوبیتِ الٰہی کے یہ سارے چاکر دم بخود اور چپ چاپ اِس کارخانۂ کائنات کے اندر مزدوروں کی طرح سارے کام کرتے رہتے ہیں اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہ تھکتے ہیں اور نہ رُکتے ہیں اور نہ عدمِ تعاون کرتے ہیں۔

یہ انتظام و انصرام ایک حکمتِ ربّانی پر قائم و دائم ہے اور وہی حکمتِ ربانی ذرّے ذرّے کی نگہداشت کا سامان اپنے آپ کرتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس چیلنج کا جواب کس کے پاس ہے۔ بس بر اُس کی قدرت ہے کہ وہ خلق پیدا کرتا ہے اور یہ اسی کے بس میں ہے کہ اپنی مخلوق کی ربوبیت پرورش اور کفالت بھی کرتا ہے۔

پھر اس رزق رسانی میں وسعت اور تناسب کا بھی ایک نظام ہے۔

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ (القصص - ۸۲)

ترجمہ:۔ اپنے بندوں میں سے وہ جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اُسے نپا تُلا دیتا ہے۔

اس قانونِ رزق رسانی کے تحت فراوانی کسی انعام کی علامت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہمیں فرعون و نمرود، شدّاد اور ہامان جیسے ربوبیتِ الٰہی سے انحراف اور غداری کے مرتکب بھی مال و دولت میں کھیلتے دکھائی دیتے ہیں اور ابوذر غفاریؓ، بلالؓ، خبابؓ اور اویسؓ قرنی جیسے لوگ بھی فاقہ مستی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ بعض اوقات رزق کی فراوانی اور کشادگی اُلٹی عذاب کا باعث بن جاتی ہے اور تنگیٔ رزق راہِ راست پر چلنے کا ذریعہ اور اپنے مالک سے تعلق کو تازہ اور قائم رکھنے کا سبب بن جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور اکرمؐ اپنے لیے رزقِ کفاف کی دُعا فرمایا کرتے تھے۔ حضورؐ نے رزق کفاف۔ یعنی بہ الفاظِ حضرت عیسیٰؑ "روز کی روٹی جو بس کفایت ہی کرے" کی وجہ یہ

بتائی کہ وہ اپنے مالک سے اپنا روز کا رزق طلب کر کے اس سے اپنا تعلق قائم اور تازہ رکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ رزق کی فراوانی اکثر ایک شخص کو اپنے خالق و مالک سے غافل کر دیتی ہے۔ اگرچہ سطح بین لوگ دوسروں کے پاس رزق کی فراوانی کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ یہی فراوانی کبھی ان کے لیے دنیا میں پاؤں کا پھندا اور آخرت میں عذاب کی بیڑی بن جاتی ہے۔ یہ تو اہل ایمان کی ہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ کم ظرف اور جامے سے باہر نہیں ہوتے اور اپنے مضبوط ایمان کی بنا پر اللہ کو ہی سارے خزانوں کا مالک کہتے ہیں۔ اگر انہیں رزق کشادہ ملے تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور خدا کی مخلوق کا حق اپنے مال و دولت میں سمجھتا اور اُسے ادا کرتے ہیں اور اگر رزق تنگ ہو جائے اور تنگدستی ہو تو صبر سے کام لیتے ہیں اور اسے خدا کی طرف سے ہی ایک آزمائش کہتے ہیں۔ کسی حالت میں بھی وہ اپنی دیانت و امانت و خودداری کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور اپنی ساری توقعات اپنے مالک سے ہی وابستہ رکھتے ہیں۔

چنانچہ فرمایا گیا۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (سبا - ۳۹)

ترجمہ: اے نبیؐ ان سے کہو، میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے اور وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے۔

گویا یہ بات بار بار دہرا دہرا کر فرمائی گئی کہ رزق کی فراہمی تو ربوبیت کا بنیادی تقاضا ہے۔ رہی رزق کی کمی و بیشی تو اس کے لیے مشیت کا اپنا ایک قانون اور پیمانہ ہے جسے مخلوق سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ جہاں تک رزق پانے کا تعلق ہے، ہر ذی رُوح پا رہا ہے۔ لیکن رزق کی فراوانی اور تنگی کا قانون مختلف ہے اور اس قانون میں اطاعت اور نافرمانی کو پیمانہ نہیں بنایا گیا ہے۔ اس کا پیمانہ پسند و ناپسند سے بھی مختلف ہے۔ نہ رزق کی تنگی معتوب ہونے کی علامت ہے اور نہ رزق کی فراوانی محبوب و پسندیدہ ہونے کی دلیل ہے۔ حقیقی مطلوب چیز خدا کی رضا ہے جو حاصل کرنے کی چیز ہے اور وہ اُس کی اطاعت و بندگی سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ خدا کی رضا اس کی مشیت سے مختلف چیز ہے اور انسان کو خدا کی مشیّت کی ٹوہ میں سرگرداں پھرنے کی بجائے اس کی رضا کو حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے جو معلوم و معروف چیز ہے۔ (باقی)

صدر قذافی اور احادیثِ نبویؐ

جناب نعیم صدیقی صاحب

صدر قذافی نے حال ہی میں ایک تقریر لیبیا کی مسجد "مسجد مولائی محمد" میں صادر فرمائی جس میں انہوں نے اس قضیے کو چھیڑا جس سے عرب ممالک کے مختلف جرائد اور اہل قلم اپنے اپنے طور پر تعرض کر رہے ہیں[1]

صدر قذافی کی گفتگو کا مرکزی مضمون یا ماحصل یہ ہے کہ رسول کی سنّت کی پیروی تو ضروری ہے لیکن احادیث کو یہ مقام حاصل نہیں۔ سنّت ایک الگ چیز ہے، اور احادیث بالکل دوسری شے ہیں۔ سنّت کی مثال یہ دی ہے کہ رسول اللہؐ مسلمانوں کے سامنے نماز صبح کی دو رکعتیں پڑھتے تھے، ظہر کی چار، مغرب کی تین، (اسی طرح دوسری نمازیں) اس سے زائد اگر نماز میں کچھ اضافہ کرتے تو فرماتے کہ یہ بطور نفل ہیں۔ یہ تعداد علانیہ طریقہ جس کو مسلمانوں کے سامنے آپؐ نے عمل سے واضح کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی نماز کا یہ طریقہ ایک زمانے سے دوسرے زمانے، اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل ہوتا رہا۔ صدر قذافی کا قول یہ ہے کہ "یہ صورت ہے جس کے صحیح ہونے کا ہم یقین رکھتے ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم یہ جان ہی نہ سکتے کہ قرآن میں نماز کا جو ذکر ہے، اس سے کیا مراد ہے"

صدر قذافی کا مدّعا یہ ہے کہ سنّت عملی شکل میں منتقل ہوتی ہے۔ رہا اُن اقوال اور بیانوں کا تعلق

[1] کویت کے مجلہ المجتمع سے استفادہ کر کے یہ مضمون لکھا گیا۔ یہ کسی مضمون کا ترجمہ نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل تحریر ہے۔ (ن - ص)

جو احادیث میں رسولِ خدا کے متعلق ہیں، اُن کو وہ غیر یقینی قرار دیتے ہیں۔ سنّت کو سنّت کے ریکارڈ کے بغیر محض عمل سے پالینے کا تصور بڑی پیچیدگیاں رکھتا ہے..... مثلاً سوچیے کہ:

۱۔ حضورؐ کے اعمال کا بصورتِ تقلید و اتباع جو انتقال بہ لحاظ زمان اور بہ لحاظ مکان یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں تک ہوا ہے، خود اُن کی شکلیں مسخ ہونے سے نہیں بچ سکیں۔ یہاں تک کہ تفصیلی طور پر نماز جیسی بنیادی اور روزمرّہ کی عبادت کی ظاہری ہیئت میں بھی، اور پڑھے جانے والے کلمات میں بھی مختلف فرقوں کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ آج بے شمار مسلمان قبروں پر سجدہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بے شمار مسلمان تصوّف کی مختلف اشکال کو لازمۂ اسلامیت سمجھتے ہیں، کوئی تفضیلِ علیؓ کو ایمان کا اساسی تقاضا قرار دیتا ہے، کوئی خارجیت کے انداز پر یزید کی مدح وستائش کو واجب سمجھتا ہے۔

کیا اِن اور اِن جیسی مختلف عملی صورتوں کو آپ سنّت قرار دیں گے، اگر نہیں تو سنّت کو متعین کرنے کا طریقہ کیا ہوگا۔

کیا اُمت کے اعمال کی مختلف اشکال لازم نہیں کر دیں گی کہ سنّت کا کوئی ریکارڈ تلاش کیا جائے اور اُس کی چھان بین کی جائے؟

۲۔ مسئلہ صرف نماز روزے جیسی عبادت تک محدود نہیں ہے، اسلامی حکومت کے دستوری اُصولوں اور اُن کے عملی نفاذ کی مسنون صورتوں کا بھی ہے، معاش اور معاشرت کے قضایا میں سنّت کی راہوں کو متعین کرنے کا بھی ہے، جنگ وصلح اور حدود و تعزیرات اور دعوت و انذار اور جماعت کے تنظیم و تزکیہ کے متعلق بھی احکامِ خداوندی کی تفصیلی عملی اشکال کے فہم و شعور کا بھی ہے۔ یہ سب کچھ اُمّت کے معمولات سے آپ کو کیسے مل سکے گا۔ مثلاً دُنیا بھر کے مسلمانوں میں مطلق العنان بادشاہت کا بھی دور رہا ہے۔ پھر دورِ حاضر میں اُن کے اندر سے جبر کیش آمریتیں بھی اُبھری ہیں، علاوہ ازیں لادین جمہوری نظام اور اشتراکی ریپبلک کے ڈھانچے بھی نمودار ہوئے ہیں۔ آخر ان سب طریقوں کا شجرۂ نسب آپ خلافتِ راشدہ سے جوڑ کر حضورؐ کی سنت تک کیونکر پہنچائیں گے۔

اس طرح تو سارا دین اُلجھ کر رہ جائے گا اور شریعت کے احکام کو متعین صورت میں حالات پر سنت کے مطابق منطبق کرنا ممکن ہی نہ رہے گا۔

صدر قذافی ذرا سا بھی غور و فکر کریں تو وہ دیکھیں گے کہ قائد اعظم یا اقبال یا شیکسپئر یا غالب کو، یا کارل مارکس اور ابراہم لنکن کو یا امام غزالی اور مولینا رومی اور شیخ عبدالقادر گیلانی اور امام بخاری کی شخصیتوں کو سمجھنے کے لیے تو زندگی کے ادنیٰ ادنیٰ معاملات کے متعلق ان کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ کاغذ کا ایک پرزہ یا کسی واقعہ سے متعلق ایک سطر بھی بڑی کاوش سے تلاش کی جاتی ہے اور اس سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں ——— حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے "مطاع" (واجب الاطاعت) نہیں بنایا گیا، ان میں سے کسی کو سنت کو معیارِ فیصلہ نہیں ٹھہرایا گیا، اور نہ ان میں سے کسی کو بے عیب اسوۂ حسنہ کا حامل نہیں گنا گیا۔ نبیؐ اکرم کا مقام تو ان میں سے کیا غیر مسلم، اور کیا مسلم، ہر ایک سے صدگونہ بلند تر ہے اور حضورؐ کو مقتداء، پیشوا، اسوہ، نمونہ اور معیار قرار دیا گیا ہے۔ پھر کیا ایسی عظیم شخصیت کی تجلیات کی عکاسی کرنے والا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے؟

صدر قذافی یہ مانتے ہیں کہ یہ ریکارڈ احادیث کے عنوان سے موجود ہے، مگر وہ کہتے ہیں کہ اس پہ قرآن کی طرح یقین نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کے متعلق شکوک و شبہات برقرار رہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر آج رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور کوئی بات زبان سے ادا کرتے، ہم اُسے لکھ لیتے تو بس سارا معاملہ ٹھیک تھا۔ ہم اس ریکارڈ کو اس بات کے علی الرغم قبول کرتے کہ ہماری گردنوں کے کٹ جانے کا خطرہ ہوتا۔

اب قذافی صاحب کے اس ارشاد پہ ذرا سا غور کیجیے۔ اس میں یہ اعتراف موجود ہے کہ حضورؐ نے اگر کوئی بات فرمائی ہو اور اس کا یقینی علم (یا ظنِ غالب) حاصل ہو جائے تو اسے قبول کرنا اور اس پہ عمل کرنا لازم ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسولِ برحق کے کلام اور حضورؐ کے اعمال (جنہیں کسی نے دیکھا ہو) ایسی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور دین و شریعت کا نظام ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تو پھر ان کے فرمودات کے مطابق آج کی اُمتِ محمدیہ کے ہاں تو سنت کے یقینی ریکارڈ کا خلاء پایا جاتا ہے اور یہ خلاء اگر ہے تو دین و شریعت کا سارا نظام ہی ادھورا ہو گیا۔ آخر آپ اس خلاء کو کیسے پورا کریں گے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضورؐ کے فرمودات اور معمولات یا بالفاظِ دیگر سنّت کے مختلف پہلو اگر آپ

کے مشاہدہ میں آجاتے اور آپ اُن کو لکھ لیتے تو کیا یہی سوال آپ کے بعد آنے والی نسلوں میں نہ پیدا ہو جاتا کہ قذافی صاحب کے دَور میں اور اُن کے بعد سنّت کا جو ریکارڈ رکھا گیا، اور جانچا، پرکھا گیا وہ ہماری نگاہوں میں مشکوک ہے۔ ہم اگر خود دیکھتے تو مان لیتے۔

اس سوال کو سامنے رکھیں تو پھر نتیجہ کے طور پر تیسرا سوال یہ نمودار ہوتا ہے کہ قول و فعلِ رسولؐ یا سنتِ رسولؐ کا جو ریکارڈ حضورؐ کے صحابہ اور اُن کے شاگردوں نے رکھا، اور جسے محدثین نے جانچا پرکھا اور جس پہ دیانت دار فقہاء نے زندگی کے مختلف شعبوں کی تعمیرات استوار کیں، کیا اسے مشکوک قرار دینے کے معنی یہی نہیں نکلیں گے کہ صدر قذافی اور اُن کے معاصرین کے مقابلے میں (نعوذ باللہ) حضورؐ سے تربیت یافتہ صحابہ اور صحابہ کے شاگرد کم قابلِ اعتماد تھے؟

خیر ان سوالوں کو چھوڑیے، ذرا ایک اور زاویہ سے نظر ڈالیں۔ ایک عالم محمد سلیمان الاشعر نے بڑے دلچسپ انداز سے صدر قذافی کا ذہنی گھیراؤ کیا ہے۔ سلیمان پوچھتے ہیں کہ چلیے سنت و احادیث کی بحث کو تھوڑی دیر کے لیے درکنار رکھ کر ہمیں یہ بتائیے کہ جس قرآن کو آپ من جانب اللہ، قابلِ یقین بنائے قانون مانتے ہیں اور جس کی تعلیمات سے اختلاف کرنے کو کسی مسلمان کے لیے درست نہیں سمجھتے ہیں، اس کی یقینی تعلیماتِ منورہ سے سرشار ہو کر آخر آپ نے ایتھوپیا میں صومالی مسلمانوں کے خلاف مخالفِ اسلام حکومت کو مدد کیسے دی؟ اور کیا یہ جائز کارنامہ ہے کہ آپ کے امدادی سامان اور مالی معاونت کا استعمال مسلمانوں کی خونریزی کے لیے ہوا۔ کیا آپ نے قرآن کا یہ حکم نہیں پڑھا تھا کہ یایھا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء۔ نیز لا تتخذوا الیہود ولا النصاریٰ اولیاء؟ آپ نے حدیثوں پر شک اور قرآن پر یقین د انحصار کر کے قرآنی مسلمانی کا یہ نمونہ کیا پیش فرمایا ہے؟ پھر سلیمان پوچھتے ہیں کہ یہ بھی فرمائیے کہ خود لیبیا میں کتنی کچھ نفاذِ شریعت کا کام ہوا ہے؟

دراصل جناب سلیمان الاشعر کے ان نشتری الفاظ کے پردے میں بڑی اہم حقیقت منعکس ہے۔

---

۱ قذافی صاحب کو ہم وہ وقت بھی یاد کراتے ہیں جب کہ وہ مصر سے آویزش پر تُل گئے تھے۔ خدا خدا کر کے اس وقت معاملہ کچھ ٹلا۔

وہ یہ ہے کہ جہاں مخالفِ اسلام قوتوں اور نظریات اور تحریکوں اور اُن کی پیدا کردہ ثقافت نے مسلمانوں پر پچھلی دو تین صدیوں سے یہ دباؤ ڈالا ہے کہ وہ احادیث کے مورچے چھوڑ دیں، خود مسلمانوں میں سے بھی جس کسی نے کوئی اُوٹ پٹانگ حرکت اپنی شانِ مسلمانی کو برقرار رکھتے ہوئے کرنا چاہی ہے، اُس نے احادیث سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے جتن ضرور کیے ہیں۔ مخالفِ اسلام تحریکوں اور پروگراموں اور رابطوں اور مفاد کے لیے جب کسی نے کام کرنا چاہا تو اُس نے اگر پورے دین کا انکار کرنا مشکل پایا، تو کم از کم احادیث کے نشاناتِ راہ کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش ضرور کی۔ قابلِ توجہ امر یہ بھی ہے کہ تارکینِ احادیث یا منکرینِ سنّت نے خالص قرآنی دین کی علمبرداری کے بعد کسی بھی دَور اور مُلک میں اپنا جو کردار پیش کیا ہے وہ کبھی اسلامی کردار نہ تھا۔ ملحدانہ علوم و افکار اور مادّہ پرستانہ تہذیب کی یورش میں یہ صرف شکست خوردہ مسلمان ہیں جو سرمایۂ احادیث کو بطور خراج اپنے فاتحین کے (نعوذ باللہ) قدموں میں رکھ دیتے ہیں، اور دَورِ حاضر کے تخت کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں کہ ہماری توبہ، ہم باز آئے ان احادیث سے جو ہمیں آزادیٔ فکر و عمل سے محروم کرتی ہیں، بس اب ہماری جان بخشی فرما دیجیے۔

اسی بیماری کا شاخسانہ صدر قذافی صاحب کی پیش کردہ وہ سبز کتاب ہے جسے وہ "نظریۂ ثالثہ" یا "تیسرے راستے" (THIRD WAY) کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ سلیمان صاحب پوچھتے ہیں کہ جب آپ کے پاس اللہ کی نازل کردہ کتاب موجود ہے تو کیا وہ آپ کی سبز کتاب کی محتاج ہے اور وہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہے؟ کل کوئی دوسرا شخص "زرد کتاب" تیسرا "سُرخ کتاب" چوتھا "سفید کتاب" (وھلم جرا) پیش کر کے کہہ سکتا ہے کہ قرآن کو مانو، اور اس کے ساتھ میری اس کتاب کو قبول کرو۔

ہر منکرِ حدیث فرد یا گروہ کی اصل بیماری یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ خیالات اور نظریات اصول اور ضابطے لوگوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ احادیث (بہ حیثیت تشریحِ احکامِ قرآنی) اس کا راستہ روکتی ہیں، اس وجہ سے وہ اپنی جگہ مجبور ہوتا ہے کہ احادیث کو راستے سے ہٹائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ نبیؐ کو مطاع اور شارع، معلم اور مزکی، اسوہ اور نمونہ اور وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ہونے کے منصبِ اعلیٰ سے ہٹا کر خود لپک کر اس مسند پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی تمام

بحثوں کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ قرآن کو لے لو، باقی ضروریات کے لیے رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے میری طرف رجوع کرو، یا کوئی شخص کسی گروہ یا پارلیمنٹ یا حکومت کی طرف بھی اسی طرز پہ بلا سکتا ہے۔

مگر قذافی صاحب یہ عقدہ حل کر دیں کہ رسولؐ تو معصوم ہوتا ہے۔ وہ نہ اپنی ذاتی خواہشات اور نہ غیر متوازن رجحانات میں اُلجھتا ہے، لیکن کیا قذافی یا کسی دوسرے شخص یا گروہ کے متعلق ہم معصومیت کا ویسا تصور باندھ سکتے ہیں اور رسولؐ کی طرح کا اعتماد کر سکتے ہیں؟

منکرینِ حدیث کی ایک لازمی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ علماء کی نہ صرف مخالفت کرتے ہیں بلکہ تحقیر بھی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ رسولؐ کی احادیث کے علم کے وارث اور محافظ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے احادیث کے انکار کا مشغلہ جبھی جاری رہ سکتا ہے کہ گروہِ علماء کے سر کچھ تاریخی جرائم تھوپے جائیں اور ان کو بے بصیرت بلکہ نالائق ثابت کیا جائے، اور موقع مل جائے تو اُن کے خون سے ہاتھ رنگے جائیں۔

قذافی صاحب نے بھی اس فارمولے پہ بڑی خوبی سے عمل کیا ہے۔

وہ علماء کے سر یہ قصور تھوپتے ہیں کہ یہ لوگ یورپ میں اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے والے ہیں (ورنہ آج یورپ، برطانیہ، امریکہ سب مسلمان ہوتے)۔ کیسے؟ وہ ایسے کہ ترکیہ کے مصطفیٰ کمال نے جب دین و دُنیا میں تفریق کر کے اسلام کو آگے بڑھانا چاہا تو اس گروہ نے اس کی تکفیر کی جس کے نتیجے میں بے شمار مسلمانوں کے سر کٹ گئے۔

اب اگر صدر قذافی نے مصطفےٰ کمال کے شروع کردہ "کارنامۂ تجدید و احیائے دین" کو از سرِ نو آگے بڑھانے کا بیڑا اُٹھایا ہے تو یہی گروہِ علماء اس کی سبز کتاب کو "اَصَحُّ الْکِتَابِ بَعْدَ کِتَابِ اللّٰہِ" تسلیم نہ کر کے دوبارہ وہی غلطی کریں گے اور دوبارہ خمیازہ بھگتیں گے۔ نیز ایک بار پھر یورپ میں فروغِ اسلام کی مساعی برباد ہو جائیں گی۔

باقی ساری برکت و سلامتی ہے تو سوشلزم کے لیے، سیکولرازم کے لیے، ایتھوپیا کے متعصب اور جبر کیش عیسائیوں اور ان کی حمایت کرنے والے روسیوں اور کیوباٹیوں کے لیے! اصل خادمِ اسلام تو بس یہی رہ گئے ہیں۔

منکرینِ حدیث والی یہ بات بھی قذافی صاحب نے دوہرا دی کہ احادیث میں سے جو بھی قرآن کے مطابق ہوگی، اُسے ہم قبول کریں گے، اور جو نہ ہوگی اُسے ہم مسترد کر دیں گے۔

قرآن کی تشریح کے لیے احادیث ہیں، اور احادیث کو جانچنے کے لیے قرآن ہے، اور ماضی میں جن بے شمار علما نے احادیث کی مفصل جانچ پرکھ کی ہے، ان کے کام کو بالائے طاق رکھ کر قذافی صاحب "سمری ٹرایل" کے اسلوب سے صحتِ احادیث کا فیصلہ کریں گے۔ اور کوئی "و" اور کوئی "ب" یا "ج" اپنی جگہ فیصلہ کرے گا کہ اُسے کونسی حدیث قرآن کے مطابق نظر آئی ہے اور کونسی مخالف۔

یار لوگوں نے تو بات یہاں تک پہنچا دی ہے کہ اگر کسی حدیث میں قرآن کے "خاص" کو "عام" اور "عام" کو "خاص" کیا گیا ہو تو یہ بھی مخالفت و تعارض ہے۔ بلکہ قرآن نے نماز کے سلسلے میں اگر رکوع اور سجدہ اور دوسرے منتشر اجزائے نماز کا ذکر کیا ہے تو کوئی ایسی حدیث مطابقِ قرآن نہیں ہوسکتی جو ان اجزا کو ایک ایسی ترتیب سے جوڑ کر اور رکعتوں کی تعداد اور خاص خاص اوقات نماز متعین کر کے کہے کہ یوں ہوگی اقامتِ صلوٰۃ۔ قرآن نے صرف یہ چاہا ہے کہ جب کسی کا جی چاہے صرف سجدہ کرلے، کبھی صرف رکوع، کبھی صرف حمد۔ باقی نماز تو عجمی سازش ہے، جسے مُلاؤں نے کمائی کا ذریعہ بنا لیا۔ مسلمان کی تو ساری زندگی نماز ہوتی ہے وہ جہاں، جس حال میں جو بھی کام کر رہا ہے، وہ اس کی دائمی نماز میں شامل ہے۔

ہمارا مشورہ یہ ہے کہ قذافی صاحب اس خاص معاملے میں پاکستان کے منکرینِ حدیث سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ یہاں کے استادانِ فن کو چاہیے کہ وہ ان پر بھرپور تبلیغ کریں۔

آخر میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ فتنۂ انکارِ حدیث سے جو خاص خاص بحثیں پیدا ہوتی ہیں اور جن میں سے کچھ کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے، ان کے جوابات چونکہ بار بار پُرزور طریق سے دیے جا چکے ہیں اور اسی کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ منکرینِ حدیث کا خواب درہم برہم ہوگیا، لہٰذا اب ان باتوں کو دہرانا غیر ضروری ہے۔

رسائل و مسائل

عُشر کے بعض ضروری مسائل

جناب ملک غلام علی صاحب

سوال: عُشر کے جن مسائل میں حنفی اور دوسرے فقہاء میں اختلاف ہے ، ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ عُشر کس قسم کی اجناس یا پھلوں پر واجب ہے ۔ بعض چارے یا نخود کی فصلیں پکائی نہیں جاتیں بلکہ کچی یا تر و تازہ فروخت کی جاتی ہیں ۔ یہی معاملہ سبزیوں کا ہے ۔ ان نقد بیچی جانے والی فصلوں (CASH CROPS) سے بڑی آمدنی حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن بعض اہل حدیث علماء فرماتے ہیں کہ عہدِ نبوی میں صرف گندم ، جَو ، کھجور اور کشمش وغیرہ پر عُشر لیا جاتا تھا اور سبزیوں پر نہیں لیا جاتا تھا ۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جو خوراک خشک ہونے کے بعد ذخیرہ میں رکھی جا سکے صرف اسی پر عُشر ہے ۔ گنے ، کپاس ، سبزی ، ترکاری وغیرہ پر اس لحاظ سے عُشر نہیں ہوگا ۔

اِسی طرح اخراجاتِ کاشت اور مصنوعی کھاد ، ٹیوب ویل وغیرہ پر جو کچھ صرف آتا ہے یا حکومت جو مالیہ یا آبیانہ وصول کرتی ہے ، یہ عُشر کی ادائیگی سے پہلے پیداوار میں سے وضع ہو سکتا ہے یا نہیں ، اس میں صحیح مسلک کیا ہے ۔ بعض جدید آلات و وسائلِ زراعت پر کثیر رقم خرچ ہو جاتی ہے جو پوری پیداوار سے بھی کئی گنا زیادہ ہوتی ہے ۔ کیا عُشر محسوب کرتے وقت اس کا لحاظ رکھا جا سکتا ہے ؟

اِن امور پر اگر قرآن و حدیث اور فقہی اقوال کی روشنی میں بحث کر کے قابلِ ترجیح مسلک جو آپ کی تحقیق میں ہو اُسے واضح کر دیا جائے اور ترجمان میں شائع ہو جائے تو رفقاء و قارئین

کے لیے افادیت و اطمینان کا باعث ہوگا۔

جواب :- (از ملک غلام علی) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہر اُس پیداوار پر عُشر واجب ہے جو قصداً زمین سے اُگائی گئی ہو اور بالکل بے قیمت اور ناقابلِ فروخت نہ ہو۔ بعض دوسرے فقہا و محدثین نے بعض خاص قسم کی زرعی اجناس پر بعض خاص شرائط و صفات کے ساتھ عُشر کو واجب قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ بطور غذا مستعمل ہوں اور انہیں سکھا کر محفوظ کیا جا سکتا ہو۔ بعض نے ان کی تعداد چار یا اس سے زیادہ مقرر کر کے ان کی نام بنام فہرست مقرر فرما دی ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے امام ابو حنیفہؒ کا مسلک قابلِ ترجیح ہے اور اُس کے حق میں کتاب و سنت سے قوی دلائل موجود ہیں جس کا اعتراف بعض قدیم و جدید غیر حنفی اصحاب نے بھی کیا ہے۔ یہ دلائل بالاختصار درج ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن مجید میں زرعی پیداوار میں سے انفاق فی سبیل اللہ کا حکم عمومی انداز میں دیا گیا ہے مثلاً فرمایا گیا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ (البقرہ - ۲۶۷)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے، اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو)

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (الانعام - ۱۴۱)

(وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اُگائیں جن میں طرح طرح کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں اور اللہ کا حق ادا کرو جب اُن کی فصل کاٹو)۔

اِن آیات میں نہ صرف حکم عام ہے بلکہ یہاں صراحت کے ساتھ ہر طرح کی پیداوار، باغات، بیلوں انگوروں، زیتون اور انار کا ذکر ہے۔ بلاشبہ اگر کوئی حدیث صحیح ایسی موجود ہوتی جو اس عموم

بن تخصیص پیدا کر دیتی تو تعمیل حکم اسی کے مطابق ہوتی مگر ایسی کوئی حدیث وارد نہیں اور جو ہیں ان کی سند قوی نہیں ہے۔ حافظ ابن الحجر نے التلخیص الجبیر میں پہلے یہ روایت حضرت معاذ رضؓ سے بیان کی ہے جو دار قطنی، حاکم اور بیہقی نے نقل کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ککڑی، تربوز، انار اور سبزیوں میں عشر معاف فرمایا ہے" اس کے بعد حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ اس روایت میں ضعف اور انقطاع ہے، یعنی سند میں اتصال نہیں ہے۔ پھر ترمذی سے سبزیوں، بیلوں کے متعلق اس مضمون کی حدیث نقل کرنے کے بعد خود امام ترمذی کا قول درج کرتے ہیں کہ:

لیس یصح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا الباب شیءٌ یعنی فی الخضراوات۔

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سبزیوں، بیلوں وغیرہ کے باب میں کوئی حدیث صحیح مروی نہیں)۔

سورہ بقرہ آیت ۲۶۷ کی تفسیر میں امام رازی لکھتے ہیں۔

ظاھر الآیۃ یدل علی الزکوٰۃ فی کل ما تنبتہ الارض علی ما ھو قول ابی حنیفۃ رحمہ اللہ واستدلالہ بھذہ الآیۃ ظاھر جدّاً الا ان مخالفیہ خصصوا عموم ھذہ الآیۃ بقول صلی اللہ علیہ وسلم لیس فی الخضراوات صدقۃ۔

(اس آیت کے ظاہری الفاظ ہر اس پیداوار پر زکوٰۃ (عشر) کو واجب قرار دیتے ہیں جو زمین سے اُگے۔ یہی ابو حنیفہ رحؒ کا قول ہے اور ان کا استدلال اس آیت سے بالکل واضح اور ظاہر ہے مگر ان سے اختلاف کرنے والوں نے اس آیت کے عموم کو اس حدیث سے خاص کیا ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ سبزیوں میں صدقہ واجب نہیں)۔

استاذ یوسف القرضاوی نے اپنی کتاب "فقہ الزکوٰۃ" جلد اوّل صفحہ ۳۵۵ پر امام رازی کا یہ تفسیری قول نقل کرنے کے بعد اس کے آخری فقرے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"لیکن سبزیوں کے بارے میں اس حدیث کا درجہ صحت کے اعتبار سے ایسا نہیں ہے کہ

یہ آیت کے عموم میں تخصیص کر سکے، اس لیے ابو حنیفہ رہ کا استدلال نہایت واضح وظاہر ہے جیسا کہ امام فخر الدین رازی نے کہا ہے۔"

فقہ الزکوٰۃ کے اس مقام پر مختلف مذاہب کے مابین محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"عشر کے معاملے میں سب سے اسلی اور قابلِ ترجیح مسلک ابو حنیفہ کا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز مجاہد تابعی، حماد، داؤد ظاہری اور ابراہیم نخعی کا مذہب بھی یہی ہے کہ جو کچھ زمین سے اگایا جائے اس پر عشر ہے کتاب وسنت کے عمومی نصوص اسی کی تائید کرتے ہیں اور یہ زکوٰۃ کے احکام وقوانین کے موافق ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حکمتِ تشریع کے خلاف ہے کہ جَو اور گیہوں کاشت کرنے والے پر تو عشر ہو اور مالٹے، آم اور سیبوں کے باغات پر عشر نہ ہو۔ جہاں تک ان احادیث کا تعلق ہے جن میں صرف چار خوردنی اجناس تک عشر کو محدود کیا گیا ہے ان میں سے کوئی حدیث بھی جرح اور تنقید سے محفوظ نہیں ہے۔ ان میں سے بعض کی سند منقطع یا ضعیف ہے یا یہ مرفوع نہیں بلکہ کسی صحابی تک موقوف ہیں (دیکھیے الرعاۃ علی المشکوٰۃ) اگر انہیں صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو ابن الملک اور دوسرے علماء نے ان کی یہ تاویل کی ہے کہ عہدِ نبوی میں وہاں یہی چار اجناس پائی جاتی تھیں اس لیے اس تعداد میں حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی واتفاقی ہے۔ (دیکھیے المرقاۃ)۔

مالکی فقیہ ابن العربی نے اپنی کتاب "احکام القرآن" میں ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تائید کی ہے۔ اپنی تصنیف عارضۃ الاحوذی شرح سنن الترمذی میں ابن عربی مالکی فرماتے ہیں :-

اقوی المذاهب فی المسالة مذهب ابی حنیفة دلیلاً واحوطها للمساکین واولها قیاماً لشکر النعمة وعلیه یدل عموم الایة والحدیث۔

(عشر کے مسئلے میں دلائل کے لحاظ سے قوی ترین اور مساکین کے حق میں محتاط ترین مذہب ابو حنیفہ کا ہے۔ شکرانہ نعمت کی ادائیگی کے اعتبار سے بھی سب سے افضل مسلک یہی ہے اور قرآن وحدیث کے عمومی احکام اسی پر دلالت کرتے ہیں)۔

ابن عربی نے آگے چل کر الانعام ۱۴۱ کے تحت بھی امام ابو حنیفہ رہ کے مذہب کی حمایت میں تفصیلاً کلام کیا ہے اور دوسرے مذاہب کا رد کیا ہے جس کا ایک مختصر ٹکڑا درج ذیل ہے :-

"ابوحنیفہ نے اس آیت کو آئینے کی طرح سامنے رکھا ہے اور مشاہدۂ حق سے کام لے کر ہر پیداوار میں عشر کو واجب قرار دیا ہے خواہ وہ غذا کے کام آئے یا نہ آئے، ذخیرہ میں محفوظ ہو سکے یا نہ ہو سکے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے عمومی ارشاد گرامی میں یہی فرمایا ہے کہ فیما سقت السماء العشر..... (جس کھیتی کو بارش سیراب کرے اس میں عشر ہے اور جسے راہٹ سے سینچا جائے اس میں نصف عشر ہے۔"

پوری بحث ابن عربی کی اصل کتاب میں قابلِ ملاحظہ ہے۔

اس کے بعد فقہ الزکاۃ کے مصنف لکھتے ہیں:۔

"سبزیوں میں عشر نہ ہونے والی حدیث ضعیف ہے جیسا کہ ابن الہمام نے فتح القدیر میں، الہیثمی نے مجمع الزوائد میں اور طبرانی نے المعجم الاوسط میں واضح کیا ہے۔ یہ حدیث کسی لحاظ سے حجت و سند نہیں چہ جائیکہ اس کے بل پر نصوص قرآنی اور احادیث صحیحہ میں تحدید و تخصیص کی جا سکے۔ پھر فقہائے حنفیہ کے نزدیک ان احادیث کی دوسری توجیہ اور احتمال بھی ممکن ہے مثلاً یہ کہ عاملینِ زکوٰۃ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ سبزیوں، خربوزوں وغیرہ کا ناپ تول کر سکیں اور ان کا عشر وصول کر سکیں کیونکہ اس سے پہلے ہی یہ اشیاء ضائع اور تلف ہو جائیں گی۔"

دوسرے الفاظ میں مصنّف کا مطلب یہ ہو گا کہ ان چیزوں کا وزن اور اُن کی قیمت اگر متعین ہو سکے تو اُن کا عشر عاملین و مصلحین کے ذریعے سے واجب الوصول ہو گا۔ چنانچہ آگے اسی بحث میں یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج اور دوسرے حوالوں سے امام زہری، عطاء الخراسانی، امام شعبی اور بعض دیگر اصحاب کا مسلک بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کی ترکاریوں اور پھلوں کی قیمت لگائی جائے گی اور اُس پر صدقہ واجبہ وصول ہو گا۔ اگر ان چیزوں کی خرید و فروخت ہو تو ان کو مالِ تجارت شمار کر کے ان پر ڈھائی فی صد زکوٰۃ بھی لی جا سکتی ہے جیسا کہ کتاب الخراج میں درج بیشتر اقوال سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جناب یوسف القرضاوی نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ اموال چونکہ زرعی دارضی پیداوار ہیں اس لیے اُن پر عُشر یا نصف عشر واجب ہونا چاہیے۔ اس مسلک کے حق میں بعض اقوال سلف بھی انہوں نے نقل کیے ہیں۔ راقم عاجز کا رجحان بھی اس دوسرے مسلک کے حق میں ہے۔ البتہ اس کی مزید تفصیل میرے نزدیک یہ ہو گی کہ جو شخص کھیتی یا باغ کا

مالک ہے یا مزارعت، بٹائی وغیرہ کے لیے اصول پر پیداوار میں حصہ دار ہے وہ اگر پیداوار یا پھل بیچے تو اپنی پیداوار پہ ۱/۱۰ یا ۱/۲۰ ادا کرے، جس نے اجارے پر زمین یا باغ لیا ہے وہ زراجات وضع کر کے باقی آمدن پر عشر یا نصف عشر دے اور مالک نے جو رقم بطور اجارہ لی ہے اس کا عشر مالک دے۔ لیکن زمین یا درخت وغیرہ کے ثمرات کی ایک مرتبہ خرید و فروخت ہونے کے بعد جب وہ بازار میں دوبارہ مال تجارت کے طور پہ فروخت ہوں تو ان پر ڈھائی فی صد تجارتی زکوٰۃ ہو گی۔

ہمارے ہاں کے بعض اہل حدیث علماء نے بھی اجناس اربعہ (جو، گیہوں، انگور، کھجور) کے علاوہ دیگر زرعی پیداوار، مثلاً گنا، کپاس، چنا وغیرہ پر عشر لازم قرار دیا ہے اور بعض نے پھل، سبزیوں کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ فتاویٰ ثنائیہ جلد اوّل، کتاب الزکوٰۃ میں اس طرح کے متعدد فتوے موجود ہیں۔ مولانا عبید اللہ مبارک پوری کے نزدیک گنے، مرچ، چنے وغیرہ میں عشر ہے۔ مولانا ابوالقاسم بنارسی کا فتویٰ ہے کہ گنے میں عشر یا نصف عشر واجب ہے جس کی تصدیق مولانا ثناء اللہ صاحب نے بھی کی ہے۔ مولانا عبد اللہ روپڑی کے نزدیک عشر چار اشیاء میں منحصر نہیں کیونکہ ابوداؤد، باب فی حکم ارض الیمن میں روئی کی پیداوار پہ عشر لینے کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح دھان، مکئی، چنا، گنا وغیرہ پر ان کی تحقیق میں عشر ہے۔ اس فتوے سے مولانا شمس الحق عظیم آبادی اور مولانا عبدالرؤف نے اتفاق کیا ہے۔ مولانا شرف الدین کے ایک الگ فتوے کے مطابق ہر قسم کے غلے اور ہر قسم کے پھل، آم، انار، سیب، سنگترہ، امرود وغیرہ میں بھی عشر یا نصف عشر ہے۔ مفصل بحث کے آخر میں فرماتے ہیں:۔

"پس ثابت ہوا کہ ادلہ صحیحہ سے ہر پیداوار میں عشر یا نصف عشر ہے اور خضراوات کے ادلہ سے کوئی بھی صحیح نہیں اور قرآن اور احادیث صحیحہ مذکورہ کے خلاف بھی ہیں۔ لہٰذا ان پہ عمل باطل اور بالفرض صحت بھی تسلیم کی جائے تو خضراوات سے مراد ساگ پات کدو وغیرہ جو اپنے کھانے کے لیے ایک دو کیاری بوئی جائے، یہ مراد ہے یہ نہیں کہ کھیتوں کے کھیت کئی کئی جگہ ایکڑ یا مربع جس سے ہزارہا روپیہ کی پیداوار ہو وہ مستثنیٰ ہیں، ہرگز نہیں، یہ نقل، عقل دونوں کے خلاف ہے اور گوبھی، گاجر، مولی، شلجم، چقندر، آلو، شکرقند وغیرہ تربوز، خربوزہ سے ہزارہا روپیہ حاصل ہوتا ہے"۔ (فتاویٰ ثنائیہ، جلد اوّل صفحہ ۴۷۵ تا ۴۷۶)

مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے سنن نسائی کے حواشی میں جو بحث درج فرمائی ہے، اس میں

بھی مذکورہ بالا نقطۂ نظر کی تائید غالب دکھائی دیتی ہے۔

جہاں تک کھیتی باڑی یا باغبانی کی نگرانی، کاشت، کٹائی، کھاد وغیرہ کے اخراجات کا تعلق ہے، فقہائے حنفیہ کے عام فتویٰ کی رُو سے اُن کا پیداوار یا اُس کی آمدنی سے وضع کر کے بقیہ پر عشر دینا جائز نہیں بلکہ جملہ پیداوار پر عشر ادا کرنا لازم ہے۔ یہ مسئلہ اکثر حنفی کتب میں مذکور ہے۔ حوالے کی حاجت نہیں۔ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ کی تصریح کے مطابق شوافع کا مسلک بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ جلد اوّل صفحہ ۶۱۷ پر مصنف لکھتے ہیں:

یحرم اعطاء اجر الحصادین قبل اخراج الزکاۃ علی المعتمد۔

(کٹائی کے اخراجات عشر کی ادائیگی سے پہلے ادا کرنا ممنوع ہے)

ابن حزم نے المحلّٰی (جلد ۵، صفحہ ۲۵۸) میں جو بحث کی ہے، اُس میں بھی یہی ثابت کیا ہے کہ کاشت کرنے، فصل کاٹنے اور صاف کر کے دانہ نکالنے، زمین کھودنے، کھاد ڈالنے اور اس قسم کے دوسرے اخراجات کو عشر کی ادائیگی سے قبل منہا کرنا جائز نہیں اور امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ اور فقہائے ظاہریہ کا مسلک یہی انھوں نے بیان کیا ہے۔

جدید آلات زراعت، ٹریکٹر، تھریشر، ٹیوب ویل وغیرہ کا بھی یہی حکم ہوگا کہ اُن کی قیمت یا کرائے کو پیداوار سے وضع نہیں کیا جائے گا، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ عام کسان کے ہل، بیل اور اُس نے جو کنواں کھودا ہے تو اس کی محنت اور معاوضے کو بھی وضع نہ کیا جائے۔ ٹیوب ویل یا کنویں کے اخراجات یا نہری زمین کے آبیانہ کو عشر سے قبل اس لیے بھی کم کرنا جائز نہیں کہ شریعت نے اس طرح کی مصنوعی اور محنت طلب آبپاشی کے لیے پہلے ہی عشر میں رعایت دے کر اسے نصف کر دیا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ہم نے ٹیوب ویل یا ٹریکٹر پر پچاس ہزار یا ایک لاکھ خرچ کیا ہے تو جب تک یہ خرچ پورا نہ ہو عشر کیسے دیا جائے؟ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کہا جائے کہ ہم نے زمین ایک لاکھ یا دو لاکھ میں خریدی ہے جب تک یہ قیمت وصول نہ ہو، عشر کیوں لیا جائے؟ اسی طرح کا بہانہ ایک تاجر بھی کر سکتا ہے کہ میں نے اس دکان یا کارخانے کے لگانے یا بنانے میں اتنا خرچ کیا ہے، اس لیے میرے اموالِ تجارت پر فی الحال زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اغنیاء محفوظ اور غربا محروم ہو جائیں گے (باقی بر صفحہ ۴۸)

(بقیہ اشارات) **(۲)**

اب ذرا ایک مختلف موضوع —— مگر بہت ہی اجمال سے!

این۔ڈی۔پی قومی اتحاد سے الگ ہو گئی۔ اس پر تبصرہ و گرفت کرنا قومی اتحاد کا کام ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ حیرت ناک ضرور ہے۔ اس وجہ سے کہ این۔ڈی۔پی کی قیادت کے آخری بیانات سے بظاہر ہوتا تھا کہ اگر اتحاد کی دوسری جماعتیں حکومت میں شامل ہو گئیں تو این۔ڈی۔پی شامل نہیں ہوگی، مگر وہ اتحاد کو چھوڑے گی نہیں۔ اس حیرت کے بعد دوسری حیرت اس بات پر کہ علیحدگی کے اعلانِ اوّل میں یہ کہا گیا کہ ہم مخالفت اور ٹکراؤ کی پالیسی اختیار نہیں کریں گے۔ اور اس دعوے کی بھی خلاف ورزی پورے زور سے ہوئی، یعنی قومی اتحاد کی بقیہ جماعتوں کی نیتیں تک محفوظ نہ رہیں۔ مزید ستم یہ کہ جو پارٹی نکلتی ہے وہ بغلیں بجا کر کہتی ہے کہ بس اب اتحاد کو ختم سمجھیئے۔ یعنی فخر ہے اس بات پر کہ ہم نے یہ کارنامہ انجام دے دیا۔

یہ بھی خالص میری ذاتی رائے ہے کہ ہمارے ہاں سیاست میں نہ صداقت کا جوہر ہے، نہ اعتدال کا، (مستثنیات اپنی جگہ)۔ بلکہ مزید افسوس یہ کہ اس ملک میں قائدین کی اگر صفِ اوّل مرتب کی جائے تو ہمارا معاشرہ ہمیں پچیس افراد بھی ایسے نہیں دے سکتا جو علاقائی اور گروہی اور وقتی مفاد سے بالاتر ہو کر نازک لمحوں میں ملک و قوم کی بے لوث خدمت کر سکیں۔ شاید نازک تاریخی لمحوں کو پہنچاننے والی بصیرت کا بھی قحط ہی پایا جائے گا۔

جمہوریت کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم، مگر جمہوریت کا اس حد تک دین و ایمان بن جانا کہ اس کے بغیر اگر قوم کے گھر میں آگ بھی لگ جائے یا ڈاکو دروازے توڑ رہے ہوں تو بھی مخالفین کے ساتھ تعاون نہیں کیا جائے گا۔ پہلے جمہوریت قائم ہو گی تو پھر آگ بجھانے کی سرگرمیوں میں حصہ بھی لیا جا سکتا ہے۔

یہاں پچھلے مختلف ادوار میں عموماً، اور بھٹو صاحب کے دور میں خصوصاً تشدد اور خیانت کا وہ درسِ عام ساری قوم کو دیا گیا ہے کہ اگر آپ بہترین جمہوری نظام بھی یہاں کھڑا کر دیں تو اس کے اندر سے بھی اور باہر سے بھی صدہا ماہرینِ نقب زنی اپنا کام شروع کر دیں گے۔ یہاں تک کہ جمہوریت کی چادرِ خاموس مچھلیاں پکڑنے کے جال میں بدل جائے گی۔

اگر قومی اتحاد کے زیرِ قیادت ہونے والے قومی ایجی ٹیشن اور پھر اس کے زیرِ اثر سامنے

آنے والے انکشافات سے صرف نظر کر لیا جائے تو ۱۹۷۰ء میں بھی تو آخر جمہوریت کا دَور دَورہ تھا اور فسطائی اقتدار نے جمہوری انتخابات کرائے تھے۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء کے احوال اگرچہ بے نقاب نہیں ہو سکے بلکہ گردشِ ایام اور زلزلہ ہائے حوادث نے اُن پر مٹی ڈال دی، لیکن کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس وقت جمہوریت کارفرما تھی۔ اوپر مارشل لا ہی کا تو تخت بچھا تھا اور اس تخت کے سائے میں وہی قوت جبلت بصیرت دکھا رہی تھی جس کے کمالات پوری طرح ۱۹۷۱ء میں نمایاں ہوئے۔ اس وقت آخر کیا جواز تھا انتخابات لڑنے اور حکومتیں قائم کرنے کا — اور بعد میں نتیجہ بھی کیا نکلا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت پاکستان کو جو اندرونی فتنۂ عظیم اور دوسرے جھمیلے درپیش ہیں۔ اُن سے زیادہ خطرناک وہ بیرونی سازشیں ہیں جن کے کارندے ہمارے اندر موجود ہیں اور بعض بڑی نمایاں حیثیتوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اقتصادی پیچیدگیاں سب کے سامنے ہیں۔

قوموں کی زندگی میں اس قسم کے مواقع جب کبھی آتے ہیں تو اُن کی سلامتی ترکِ اختلاف اور اتحاد میں ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں حکومت اور اپوزیشن کا فرق مٹا دینا چاہیے، ایسے حالات میں صوبوں اور علاقوں اور طبقوں کے مفاد کی رسہ کشی باقی نہیں رہنی چاہیے —— اور سازشی کار قوتوں کو یہ محسوس ہونا چاہیے کہ پاکستان کے قلعے کی دیوار کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ کہیں کوئی رخنہ بن نہیں سکتا۔ بخلاف اس کے اگر نقشہ یہ ہو کہ ایک حکومت ہے اور ایک اپوزیشن، فلاں پارٹی کا رُخ مشرق کو ہے اور فلاں کا مغرب کو، کچھ لیڈر پاکستان بھر کے مفاد کو سوچتے ہیں اور کچھ مخصوص علاقوں یا طبقوں کے مسائل کو، ایک طرف کی قوت اسلام کو برسرِ عمل لانے کی آرزومند ہے اور دوسری جانب سیکولرازم کے علمبرداروں کا دھڑا ہے —— تو ایسی صورت میں بیرونی قوتوں کے لیے کام کرنے کے ہزار راستے موجود ہیں۔

خدا نہ کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ موجودہ مارشل لا حکومت انتخابات کرا کے رخصت ہو تو پھر جمہوری قبا میں کوئی دیوِ استبداد رقص کرنے لگے۔ یا یہی مصیبت سامنے آجائے کہ چند ایسی بے اکثریت پارٹیاں کامیاب ہو جائیں جن کے اتحاد پر ہی ملک کی سلامتی اور قوم کی فلاح کا دارومدار ہو اور اتحاد کے ٹسٹ میں، بغیر حکومت ملے چند قوتیں جس طرح ناکام ہوئی ہیں، اُسے دیکھ کر اُن سے کیا اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ حکومت چلانے کے لیے بُنیانِ مرصوص بن سکیں گی اور اپنے خوبصورت

مواعید و اعلانات کو نبھا سکیں گی۔

ان دونوں صورتوں میں فدائیانِ جمہوریت کا رویہ کیا ہوگا؟

قومی اتحاد کے سامنے حکومت میں جانے کا سب سے بڑا اصولی مقصد یہ رہا ہے کہ انتخابات جلد کرانے اور جمہوریت کو بحال کرنے کی کوششیں تعاون کے راستے سے کی جائیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہوگی کہ لیڈروں کی سواریوں کے گذرنے کے لیے جمہوریت کی "جرنیلی سڑک" بن جائے، مگر اس سڑک کے بنانے میں جو لوگ حصہ لینا چاہتے ہیں، ان کو اتنا بر سر غلط بھی کیوں سمجھا جائے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ وہ بھی بیٹھ کر جرنیلی سڑک بننے کا انتظار کریں۔ ایک غیر جمہوری حالت سے نکلنے کے لیے بھی تو کام کرنا ضروری ہے۔ کسی جمہوریت نواز کو اس سے گریز کیوں؟

یہ بات تو محض اصولاً کہی گئی ہے، ورنہ خاصے واضح امکانات کے باوجود اب بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قومی اتحاد سے متعلق جماعتوں کی عبوری حکومت قائم ہو سکے گی، کیونکہ انہوں نے بیوروکریسی کے زیر سایہ کام کرنے سے انکار کر کے ملک کی اس سب سے بڑی منظم جماعت کو اپنے خلاف کر لیا ہے (جمہوری نقطہ نظر سے قومی اتحاد کا یہ بھی بہت بڑا کارنامہ ہے) اور ظاہر ہے کہ یہ قوت آخری لمحے تک روڑے اٹکانے کی کوشش کرے گی۔

کلمۂ آخر یہ کہ جمہوریت سے بھی کچھ چیزیں مقدم و برتر ہیں۔ مثلاً آزادی! اسی طرح بقا، آزادی اور سالمیت کی خاطر سنگین حالات سے جہاد کرنے والی قوم کے لیے اتحاد بہت ضروری ہے۔ اور معاملہ جب رسول اللہؐ کی امت کا بیش نظر ہو تو اتحاد و اخوت لازمۂ ایمان ہیں اور حضورؐ کی ایک قیمتی میراث ۔ اس کا تحفظ لازم ہے۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

اسی طرح ایک بڑا زمیندار مشینی ذرائع اور کیمیاوی کھاد استعمال کرتا ہے تو اس سے پیداوار میں افزائش ہوتی ہے یا وقت اور محنت کی بچت ہوتی ہے۔ چھوٹا کاشت کار اپنے ہاتھ پاؤں اور جانور استعمال کرتا ہے۔ ان میں امتیاز برتنے کے لیے کوئی شرعی یا عقلی بنیاد نہیں ہے۔ البتہ حکومت کا مالیہ (آبیانہ نہیں) عشر سے پہلے ادا کرنے کی اجازت بعض قدیم فقہاء نے بھی دی ہے اور بعض جدید علماء کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ اس کے حق میں دلیل یہ ہے کہ اس کا کوئی تعلق براہ راست اصلاح زمین، اضافہ پیداوار یا اخراجات کاشت سے نہیں ہے۔ اس لیے عشر محسوب کرنے سے پہلے اسے پیداوار میں سے وضع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔